

زبانیں جہاں چُپ ہیں

پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیماہ کا پشتون ناول "طالبہ خدائے کہ بہ ملاشے" جہاں پشتون اہل قلم میں اپنے موضوع کے اعتبار سے مقبولیت حاصل کر چکا اور اسے ایوارڈ بھی ملے، وہاں اُردو زبان میں بھی اس ناول کو ترجمہ کرنے اور پیش کرنے کی اہمیت، اپنے سنجیدہ موضوع کے حوالے سے محسوس کی گئی۔ ایسا موضوع جس نے اس مخطی کے عوام کو بالخصوص اپنے لپیٹ میں گزشتہ چالیس برس سے لے رکھا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ عالمی سطح پر، اس مخطی میں، اپنے مخصوص کردار کے حوالے سے طالب یا طالبان کی شہرت پھیلی ہوئی ہے، جس پر بڑے بڑے مہمان ادیبوں اور دانشوروں نے قلم فرسائی کی ہے، اور اس حوالے سے پیدا ہونے والے مسائل کی جڑوں تک پہنچنے کی سعی کرتے رہے ہیں۔

طالب یا طالبان، پشتون معاشرے میں صدیوں سے ایک زندہ کردار کے طور پر نمایاں رہے ہیں۔ لغوی طور پر طالب (طلب کرنے والے) درحقیقت علم کی طلب کرنے والے کو پشتون معاشرے میں طالب کہا جاتا ہے۔ وہ بھی دینی اور مذہبی علم حاصل کرنے والے کو۔ ویسے تو اصطلاح اُردو زبان میں بھی طالب علم کی صورت میں مروج ہے۔ لیکن پشتون میں اس کا تعلق بطور خاص مذہبی درسگاہوں سے ہے۔ جہاں پشتون اپنی اولادوں کو دینی اور مذہبی علوم سیکھنے کیلئے بھیجتے ہیں۔

مذہبی درسگاہوں میں علم کا حصول زمانہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ اسے بجا طور پر یہودیت اور عیسائیت کا ثمرہ کہا جاسکتا ہے۔ اصطلاحات بے شک مختلف ہیں لیکن اسلام میں اس کا آغاز "مدرسہ جنیدیہ" سے ہوتا ہے۔ جو تصوف کے میدان میں "امام تصوف" کہلائے جاتے ہیں۔ اسلام میں جب خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو اس کے رد عمل میں ایسے مدارس کا آغاز ہوا جس کا سلسلہ ابھی تک چلا آ رہا ہے۔ ہم اس کے تاریخی پس منظر میں، نہیں دیکھنا چاہتے کہ اس طرح

بات کی لانا ہو جائے۔

زیر نظر ناول کو پشتوزبان میں بھی ہم نے پڑھا تھا، اور اب اردو زبان میں، جس کا ترجمہ کرنے کا شرف "نجیب اللہ زڑ گئے علی خیل" کو حاصل ہوا، بھی ہماری نظروں کو دعوتِ مطالعہ کرنے کیلئے پیش ہوا۔ تو ممنونیت کے اظہار کے طور پر چند سطریں تحریر کر رہا ہوں۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ اپنے موضوع کے اعتبار سے اس کا ترجمہ یقینی طور پر وقت کی اہم ضرورت ہے۔ فاضل ناول نگار پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیماں نے "بدنام زمانہ طالب" (معذرت کے ساتھ) کے کردار کو اس زمانے سے منسلک کیا ہے جب پڑوسی ملک افغانستان میں طالبان کا دور حکومت تھا۔ عالمی سیاست میں طالب کے کردار کو کس طرح استعمال کیا گیا، اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں ناول کے طالب عبد الوالی کی نفسیات کو بھی سمجھنا ہو گا۔ جو بظاہر تو فرد واحد ہے لیکن اپنے کردار کے پس منظر میں وہ اُن تمام طالبان کے کردار کو نمایاں کر رہا ہے، جو پشتون معاشرے میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور جو اب اپنے اصل کردار کے علاوہ، دوسروں کے اشاروں پر ناچ رہے ہیں، لیکن کیوں؟ اس کیوں کا جواب حاصل کرنے کیلئے فاضل ناول نگار نے پشتو میں کہ وہ خود بھی پشتون ہیں اور پشتون مزاج اور نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، بڑی خوبی کے ساتھ اپنے فکر و فہم کو استعمال کر چکے ہیں۔ ہم نے بحیثیت ایک پشتون کے جو ذائقہ اس ناول کے پشتو ورژن میں محسوس کیا، وہی ذائقہ اردو ورژن میں محسوس کیا۔ اس میں مترجم بھی داد کے مستحق ہیں۔ تاہم زبان و بیان کے سلسلے میں جو تھوڑی بہت کمزوریاں نظر میں آئی تھیں، وہ دور کردی گئی ہیں۔ اور اب یہ اردو دان طبقے پر منحصر ہے کہ وہ اس ناول کو پڑھتے ہوئے پشتون معاشرے میں طالب کے کردار کو اپنے فہم اور دانست میں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کیوں کہ اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو طالب بھی ایک انسان ہے، ہماری اور آپ کی طرح کا۔ وہ طالب کیوں بنتا ہے، طالب بن کر کیا کام کرتا ہے۔ ایک طالب اپنے آپ کو، اپنے خاندان کو، اپنے آس پاس کے ماحول کو، اور سب سے زیادہ اپنے جذبات اور خواہشات کو کن پیمانوں سے تولتا اور پرکھتا

ہے۔ اس کو جانے کے بعد اب طالب کو اتنا مورد الزام نہیں ٹھہرائیں گے۔ جتنا کہ عوامل کو کوسیں گے۔ جو طالب کو اپنے اصل ہدف سے ہٹا کر کسی اور سمت میں دھکیل چکے ہیں۔

فی زمانہ اگر طالب قابل نفرت ٹھہرایا گیا ہے، تو طالب کو موجودہ روپ دینے میں وہ عوامل زیادہ قابل نفرت ہیں جنہوں نے اپنی علیت اور ذہانت کی بجائے اپنی جہالت اور کج فہمی کا ثبوت، طالب سے بڑھ چڑھ کر دیا ہے۔

زیر بحث ناول ۲۳ ابواب پر تقسیم ہے۔ جس میں عبدالولی کے مدرسہ کے طالب بننے سے لے کر جنگجو طالب بننے تک کی داستان رقم ہے۔ یہ ایک طالب کی نفسیات کی کہانی ہے جو ہماری اور آپ کی طرح کا انسان ہے، جو جذبات اور خواہشات رکھتا ہے۔ جس کی حقیقی انسانی جذبات اور خواہشات کو معاشرہ میں غریب اور امیر کی تفریق نے بری طرح سے کچل کر رکھ دیا ہے۔ یہی تفریق اس کی شخصیت کے خدوخال کو ابھارتی ہے۔ اور ایک ایسی کہانی جنم لیتی ہے جو نہ صرف ایک انسان کی کہانی ہے بلکہ ہمارے موجودہ دور کی بچیہ گری کی طرف بھی ہماری توجہ مبذول کرتی ہے۔

ناول کے پہلے پانچ ابواب طالب عبدالولی کی شخصیت سازی سے متعلق ہیں جو پشتون معاشرہ میں معاشی و مالی تفاوت کے پیش نظر خانگی زندگی، سماجی اور معاشرتی طور پر بہت کا کام دے رہے ہیں۔ ایک طالب جو مذہبی علوم کے حصول کیلئے وقف کر دیا جاتا ہے تو گویا اُسے دنیاوی مشاغل سے کٹ آف ہونا پڑتا ہے۔ کم عمری میں ایک طالب یہ جبر اس کی نفسیات پر ایک کاری ضرب ہی تو ہے۔

چھٹے باب میں منظر نامہ تبدیل ہوتا ہے۔ کہ اُن دنوں افغانستان میں تحریک طالبان نے سر اٹھایا تھا۔ افغانستان کے عوام مجاہدین کے داخلی جھگڑوں سے تنگ آچکے تھے۔ مجاہدین کمانڈروں نے اپنے علاقے تقسیم کیے تھے۔ ایک مرکزی حکومت نہیں تھی۔ افغانستان میں مدد کرنے والے ممالک خاص طور پر مغربی ممالک اور امریکہ اپنے مفادات حاصل کرنے کے بعد افغان عوام اور افغانستان کو اسی طرح بے یار و مددگار اور مجاہدین کو آپس میں لڑتا چھوڑ گئے تھے۔

طالبان کے آنے سے افغانستان کی صورت حال میں تبدیلی تو آتی ہے، لیکن ایک جبر کے ساتھ۔ اور اس میں طالب عبد الولی جو نفسیاتی طور پر ایک جھگڑالو طالب کمانڈر بن چکا ہوتا ہے، اور جب وہ اپنے دوست اللہ داد کے ساتھ بحث و تکرار کے بعد خود سے ہمکلام ہوتا ہے۔

"مزہ۔ عبد الولی خود سے ہمکلام ہوا۔ مزہ، میرا بس چلے تو اس مزہ لفظ کو کتاب سے نکال دوں۔ جس کسی نے ہماری زندگی سے مزے چھین لیے ہیں، انہیں بھی زندگی سے مزے لینے نہیں دوں گا۔"

یہ وہ نفسیاتی کیفیت تھی جس نے طالب عبد الولی کو ہمدردی اور محبت کی دنیا سے دور نکال دیا تھا۔ اپنے دوست اللہ داد کے لاکھ سمجھانے کے باوجود وہ چند دنوں کیلئے بھی اپنے گھر جانے اور ماں باپ کو دیکھنے کیلئے بھی رضامند نہیں ہوتا۔

ناول کے تیرہویں اور چودھویں باب میں طالبان کی حکومت چھائی رہتی ہے۔ ایک وسیع علاقے میں طالبان کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ گمشدہ افراد یا طالبان کی تلاش میں ان کی ملاقات جیل میں قید ایک ایسے شخص سے ہوتی ہے جو انقلاب کا حامی ہوتا ہے۔ عاقل، بالغ اور سمجھدار، طالبان کی قید میں دیوانہ مشہور ہوتا ہے۔ وہ عبد الولی سے اپنی داستان بیان کرتا ہے۔

عبد الولی بھی اُس کو دماغی مریض سمجھتا ہے۔ جب اُس کے ایک سوال کے جواب میں وہ کہتا ہے،

"وہ اس لیے ایسا کرتے ہیں کہ پیٹھ پیچھے اسلامی لباس میں وہ خفیہ قوتیں نظر آتی ہیں جنہیں یہ دیکھ نہیں سکتے۔ کام وہ کرتے ہیں، نام ان کا استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ سوچتے ہیں اور اس طرح سوچتے ہیں انہیں قید کر دیا جاتا ہے۔ جس طرح مجھے قید کیا گیا ہے۔"

اسی طرح سترہویں باب میں عبد الولی کے پچازاد بھائی سلیم کے انخواہونے اور اسی کے ہاتھ دستیاب ہونے اور پھر اُس سے انتقام لینے اور اُس کو چھوڑ دینے میں عبد الولی جس ذہنی کیفیت سے گزرتا ہے وہ اُس کے نفسیات پر مکمل روشنی ڈالتی ہے۔

اور جب کہانی کا اختتام ہوتا ہے تو ایک اور حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔ طالب عبد الولی
سمجھ نہیں پاتا کہ اُسے اب آگے کیا کرنا چاہیے۔

افغانستان کی گزشتہ چالیس سالہ تاریخ نے اپنے واقعات اور حوادث کی روشنی میں کتنی
کہانیاں جنم دے رکھی ہیں۔ اسی کا ایک عکس آپ کو اس ناول میں اپنی کئی کیفیتوں کے ساتھ ملے
گا۔ جسے حساس لوگ ہی سمجھ پاسکتے ہیں۔

ہماری طرف سے فاضل ناول نگار پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیماب اور مترجم نجیب اللہ
زڑگئے علی خیل کو اس کاوش پر مبارک باد قبول ہو۔

عمر گل عسکر

نواں کلی، کوئٹہ

۱۱،۰۷،۲۰۱۷

عرض مترجم

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے قلم سے آشنا کیا اور مجھے توفیق دی کہ میں اس قلم سے اپنے قوم، ملک اور زبان کی خدمت کر سکوں۔

محترم قارئین "طالب" ہمارے پشتون معاشرے کا ایک اہم کردار ہے جسے ہم اپنے غم، خوشی اور خاص مواقعوں پر ہی یاد کرتے ہیں۔ جیسے قرآن خوانی، فوٹنگی، نکاح، فاتحہ خوانی، یا پھر بچے کی پیدائش پر اس کے کان میں آذان دینے کیلئے۔ مگر کبھی بھی ہم نے طالب کو اس نظر سے نہیں دیکھا جس نظر سے ہم کسی سکول، کالج، یا پھر یونیورسٹی میں پڑھے جانے والے Students یعنی جدید عصری تعلیم کے طالب کو دیکھتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کی بہت عزت کرتے ہیں جو فرافراٹکس بولتے ہیں۔ جینز پہنتے ہیں اور فیشن ایبل زندگی گزارتے ہیں۔ اور دوسری طرف ہمارے معاشرے کے اس اہم کردار کو جسے طالب کہا جاتا ہے سادہ لباس پہنتے، مسجد اور مدرسہ میں پڑھتے ہیں، روکی سوکھی روٹی سے گزارا کرتے اور علم کے متلاشی ہوتے ہیں۔ پھر اس سادہ لوح انسان کو عالمی قوتیں مذہب کے نام پر اکسار اپنے مخصوص مقاصد کیلئے استعمال کر کے پتہ نہیں کیا سے کیا بنا ڈالتے ہیں۔ مذہب کا یہ شیدا کی کسی کی بھی باتوں میں آکر یہ نہیں دیکھتا کہ وہ کس لیے اور کس کیلئے استعمال ہو رہا ہے۔

انہی باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارے پشتوزبان کے نامور نقاد، افسانہ نگار اور ناول نگار جناب پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیما ب نے طالب کی زندگی کو بھرپور انداز میں ناول کی صورت میں پیش کیا جسے عوام اور ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا اور دوسرا ایڈیشن تک چھپ گیا۔ اس معیار اور پزیرائی کو مد نظر رکھ کر میں نے پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیما ب سے بات کی اور ان کی اجازت سے اس ناول جس کا پشتو میں نام "طالبہ خدائے کہ بہ ملاشے!" ہے کو اردو زبان میں "طالب!" کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس ناول میں آپ کو پشتوزبان کے ایسے الفاظ پڑھنے کو ملیں گے جو کہ پشتوزبان کے اپنے علاقائی الفاظ ہیں جن کا اردو میں ترجمہ کرنا زرا مشکل تھا۔ پر قارئین کی آسانی کیلئے ان الفاظ کے تشریح نیچے حاشیہ میں دیے گئے ہیں۔

آخر میں اُن احباب اور دوستوں کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے میری حوصلہ افزائی کی اور مجھے نیک مشورے دیے اور اس ناول میں خصوصی دلچسپی ظاہر کی۔ خصوصاً ڈاکٹر عبد الرحمن نوید صاحب کا جنہوں نے اس ناول کی پروف ریڈنگ میں دن رات محنت کی اور جناب نامور شاعر و کالم نگار عمر گل عسکر صاحب کا جس نے اس ناول پر اپنا علمی نقطہ نظر آپ قارئین کے سامنے پیش کیا۔ میرے قریبی دوست ایڈوکیٹ ظفر اللہ باڑی، انجینئر محی الدین کاکڑ، سید عصمت اللہ آغا، خدائے نور خان کاسی، سید نذیر خاں کاسر، شراف الدین کاکڑ، عبد القادر کاکڑ، فضل الرحمن سنگریا، اچکزئی، پہلوان نعمت اللہ علی خیل، عصمت اللہ علی خیل، چیمپینین پہلوان عنایت اللہ علی خیل، واجد الرحمن رحمانی، راز محمد عرف داؤد بیازئی، احسان اللہ ترہ کئی، پہلوان حفیظ اللہ ترہ کئی، ایمیل خان مشوانی، عبد اللہ مشوانی، نظام الدین مشوانی، محمد اصغر مشوانی، عبد العنان مشوانی، شہیم کاکڑ، خلیل خان کاکڑ، ڈاکٹر منظور احمد، شاہ محمد لاگو، ایڈوکیٹ آصف خان غلمی، ایڈوکیٹ قاسم خان غلمی، سید علی آغا، سید عباس شاہ مخلص، علی محمد کاکڑ، اور نگزیب، احسان اللہ احسان، پروفیسر رئیس خان، محترم سلیم بگٹش صاحب، حبیب اللہ کاکڑ صاحب، لعل محمد اور کزئی صاحب، رئیس رحمان منگل، طاہر زلاند مندوخیل، محمد جعفر فٹالر، بازخان المیار، ڈیزائنر خلیل اللہ نصیم اور خصوصاً پروفیسر ڈاکٹر نصیب اللہ سیما صاحب کا بے حد مشکور ہوں جنہوں نے مجھے اس کتاب کو اردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت دی اور ساتھ ہی ساتھ ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو امن اور سلامتی کا گہوارہ بنائے، آمین۔ آپ سب قارئین کے روشن اور پرامن مستقبل کا دعا گو۔ والسلام

نجیب اللہ زنگے علی خیل

جنوبی پشتونخوا، ضلع کوئٹہ

۲۰۱۷ء، ۲۰۱۷ء

(1)

وہ جیسے ہی اپنے گاؤں کے قریبی قبرستان کے ٹیلے پر پہنچا تو اُس نے محسوس کیا کہ قبرستان میں قبروں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔

عبدالولی، جسے یہ پتہ بھی نہیں تھا کہ اُس کے گھر میں کوئی ہو گا بھی یا نہیں۔ وہ تو اُس جواری کی طرح تھا جو اپنا سب کچھ ہار چکا ہو، سب کچھ۔ ایک ایسا احساس جو وہ اپنے ساتھ جاتے ہوئے لے گیا تھا، مگر حالات کے تھیرٹوں نے اُسے ایک فقیر کی شکل میں واپس اپنے گاؤں بھیجا تھا۔ اُس کی آنکھوں کی وہ چمک جو وہ بچپن میں اپنے ساتھ لے گیا تھا ماند پڑ گئی تھی۔

عبدالولی، اس سوچ میں تھا کہ گھر کے افراد اُسے پہچان بھی لیں گے یا نہیں۔ ماں، وہ پیاری ماں، جس کے قدموں تلے جنت ہے، کیا وہ مجھے پہچان لیں گی؟ کیا ایسا تو نہیں کہ وہ اس دنیا میں نہیں؟ نہیں، نہیں، وہ ضرور زندہ ہوگی۔ مگر، اگر وہ زندہ ہو بھی تو کیا مجھے پہچان پائیں گی؟

عبدالولی، جس نے اپنے وطن اور ملت کیلئے ایک لمبا سفر طے کیا تھا۔ وہ بھی اِس خاطر کہ اُس کے اِس کانٹے دار سفر سے میرا وطن تمام مصائب سے چھٹکارا پاسکے گا۔ وہ اسی سوچ میں قبرستان کے ٹیلے پر کھڑا گاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دو تین قدم چلنے کے بعد عبدالولی نے پہلے سڑک اور پھر اپنے پاؤں کے نیچے کی مٹی کو دیکھا، اُس نے زمین کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا اور مٹی اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے غور سے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے وہ مٹی کو چومنے لگا اور پھر اُسے اپنی آنکھوں سے لگانا شروع کیا۔ ایسے جیسے متبرک کتاب کے متبرک اور اق کو لوگ احتراماً چومتے ہیں۔ مڑ کر قبرستان کو دیکھا، آنکھوں میں آنسو اُبل پڑے۔ دل میں ایک ٹیس سی محسوس کی اور ساتھ ہی اس خیال نے اُسے آگھیرا کہ خدا نہ کرے کہ میری ماں اِس قبرستان کی کسی قبر میں ابدی نیند سو رہی ہو؟ اِس خیال سے عبدالولی کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ مٹی سے بھری مٹھی کھل گئی اور مٹی واپس گرد کی شکل میں زمین پر پھیل گئی۔ عبدالولی سب کچھ بھول چکا تھا، وطن کی محبت، دین کی

محبت، زر قاقا کی محبت، باپ بھائیوں کی محبت، وہ سب کچھ، سب کی محبت بھول چکا تھا۔ جو وہ بھول نہیں پارہا تھا وہ تھی ماں کی محبت۔

اُس کی لاکھ کوشش کے باوجود ماں کی محبت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کا لوگوں سے اعتبار اُٹھ چکا تھا۔ نہ ہی اُسے رشتہ داروں پر اعتبار تھا نہ ہی اُسے اپنی محبت پر اور نہ ہی اُسے اپنے آپ پر اعتبار تھا۔

جس پر اعتبار کیا تھا انہی لوگوں نے اُسے دھوکہ دیا تھا۔ اُس نے ہر قدم پر دھوکے کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اُس کی زندگی فریب در فریب کھانے سے تاریک بن چکی تھی۔ مگر اِس تاریکی میں کہیں دُور آسمان پر ایک چمکتا دھمکتا ستارہ نظر آرہا تھا۔ یہ ستارہ عبدالولی کی ماں کی محبت کا ستارہ تھا، جس کے احساس نے عبدالولی کو اب تک زندہ رکھا ہوا تھا۔ اِس احساس پر کہ ایک نہ ایک دن میں اِس ستارے تک ضرور پہنچو گا۔ اور اِسی احساس کی وجہ سے آج عبدالولی اُس ٹیلے پر کھڑا تھا جس پر وہ آج سے ۲۵ برس پہلے ۱۰ سال کی عمر میں اُس سفر پر روانہ ہوا تھا جس سفر میں اُسے ہر اُس بندگلی کا سامنا کرنا پڑا جس سے اُس کی بہت سی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اُس ٹیلے پر اُسی طرح کھڑا تھا جیسے وہ ابھی ابھی اِس ٹیلے سے، اُس تھکا دینے والی سفر کیلئے روانہ ہوا تھا۔

• زر قاقا: پشتو زبان میں مادہ چکور یعنی چکوری کو کہتے ہیں۔ عام طور پر پشتونوں میں یہ نام لڑکیوں کیلئے کافی زیادہ استعمال ہوتا ہے۔

(۲)

کتنی بار کہا کہ آج روٹی نہیں پکائی، جاؤ یہاں سے۔۔۔۔۔ جب دیکھو منہ لٹکائے
دروازے میں کھڑا رہتا ہے۔

کل بھی آپ نے روٹی نہیں دی۔۔۔۔۔ میں تھوڑی دیر بعد آ جاؤں گا۔۔۔۔۔
ضرورت نہیں دوبارہ آنے کی۔۔۔۔۔ ہمارے گھر میں خود مہمان ہیں۔ عورت نے
بچے کو حقارت سے جواب دیا۔

نہیں خالہ۔۔۔۔۔ مجھے مولوی صاحب پھر ماریں گے، وہ کہتے ہیں تم روٹی نہیں
لاتے۔

تم جاتے ہو یا میں مولوی بن جاؤں۔ اتنا ماروں گی کہ نانی یاد آ جائے گی۔ عورت نے
چھوٹے بچے کو، جو کہ پاس ہی کہ مدرسے کا طالب تھا بھگا دیا۔

اس چھوٹے طالب کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اپنے مدرسے جہاں وہ پڑھتا تھا کیلئے اور
مولوی صاحب جو مدرسہ کے مہتمم اور مسجد کے پیش امام تھے کے گھر کیلئے گاؤں کے ہر گھر جا کر
روٹی سالن اکٹھا کرے۔ جب کبھی یہ وظیفے • کم پڑ جاتے تو مدرسہ کے بڑے طالبان کے ساتھ
ساتھ مولوی صاحب کے گھر میں بھی اُس کی شامت آ جاتی۔ جس دن اُس کے اکٹھے کیے ہوئے
وظیفے کم ہوتے بڑے طالب اُس دن اُسے روٹی کا ایک نوالہ بھی نہیں دیتے۔

• وظیفہ: مسجد یا پھر چھوٹے مدارس کا ایک نوعمر طالب مسجد کے آس پاس کے گھروں میں جا کر مسجد یا پھر
مدرسہ کے طالبان اور امام مسجد کے گھر کیلئے سالن اور روٹی اکٹھا کرتا ہے۔ پاکستان کے پشتون علاقوں اور
پورے افغانستان میں یہ رواج ہے۔ تاریخ مذاہب کے حوالے سے یہ رواج بدھ مذہب میں گوتم بدھ
(پیدائش: ۵۶۰ ق م یا ۵۶۵ ق م) (وفات: ۴۸۰ ق م، ۳۸۸ ق م) کی زندگی سے اب تک رائج ہے۔

آج بھی اُس کے اکٹھے کیے ہوئے وظیفے کم تھے۔ لسی کی بالٹی میں گاؤں کے ایک بچے نے مٹی ڈال دی تھی۔ چھوٹا طالب اس وہم میں تھا کہ آج پھر اُس کی خیر نہیں۔ آہستہ آہستہ قدموں سے مدرسے کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

جلدی آؤ۔۔۔۔۔ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔ کبھی بھی تم وقت پر نہیں پہنچے۔۔۔۔۔ سارا دن تم ہو اور تمہاری کھیل کھود۔ ایک بڑے طالب نے اُسے غصے سے کہا۔

جاؤ، دوسرے حجرے سے گلاس لے آؤ اور اُس میں لسی ڈال دو اور روٹی کو دسترخوان میں رکھ دو۔ ایک اور بڑے طالب نے کہا۔

چھوٹا طالب دوسرے حجرے میں چلا گیا وہاں بھی ایک بڑا طالب بیٹھا کسی دینی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا، چھوٹا طالب ڈر کے مارے لسی کی بالٹی ایک طرف رکھ کر روٹی کی چادر جس میں اُس نے گاؤں کے ہر گھر سے وظیفے اکٹھے کیے تھے بڑے طالب کے قریب رکھ دی۔

مولوی صاحب کے گھر میں روٹی دی یا نہیں؟ بڑے طالب نے بغیر کتاب سے آنکھ ہٹائے چھوٹے طالب سے پوچھا۔

نہیں، نہیں دی۔ چھوٹے طالب نے گھبراتے ہوئے جواب دیا۔
تو پھر یہ روٹی کیوں کم ہے؟ بڑے طالب نے پیار سے پوچھا۔
میں کیا کروں۔۔۔ گاؤں کے تمام گھروں کو جاتا ہوں، کوئی کہتا ہے ابھی تک نہیں پکائی۔ کوئی کہتا ہے کہ گھر میں مہمان ہیں۔

• حجرہ: جہاں طالب اُٹھتے، بیٹھتے اور سوتے ہیں۔ خیبر پختونخوا اور افغانستان کے کچھ علاقوں میں بیٹھک کو حجرہ کہتے ہیں۔

اسی اثناء میں وہ دونوں بڑے طالب جو باہر بیٹھے تھے اندر کمرے میں داخل ہوئے۔ ایک طالب کے بال بڑے، داڑھی لمبی، سر پر ایک بڑا سیاہ عمامہ جیسے وہ کسی تنظیم کا سربراہ ہو لسی کی بالٹی پر نظر پڑ جاتی ہے۔ ایک دم وہ چھوٹے طالب کی گردن پر تھپڑ مارتا ہے۔ اس تھپڑ سے چھوٹے طالب کے منہ سے بے اختیار ایک ایسی چیخ نکلتی ہے جیسے اُسے گولی لگ گئی ہو۔

کیا ہوا؟ کیوں مار رہے ہو؟ کتاب کے سامنے بیٹھے طالب نے دوسرے بڑے طالب

سے پوچھا۔

کیوں نہ ماروں، تم ذرا یہ لسی کی بالٹی تو دیکھو۔

کیوں کیا ہوا ہے لسی کو؟

وہ گاؤں کے ایک لڑکے نے اس میں مٹی ڈال دی۔ چھوٹے طالب نے روتے روتے

جواب دیا۔

کیا کہا؟ کیوں یہ نہیں کہتے کہ تم خود بیکار ہو۔ سارا دن تم گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ

کھیلتے رہتے ہو۔

مولوی اعظم حوصلہ رکھو۔ بچہ ہے، آہستہ آہستہ سمجھ جائے گا۔۔۔۔ کتاب والے

طالب نے لمبے بالوں والے طالب کو تسلی دی۔

اس نے مار نہیں کھائی، ماں کی گھود میں نازو سے پلا بڑا ہے۔ ہم بھی بچے تھے، مگر اتنے

بڑ حرام نہیں تھے جتنا یہ ہے۔۔۔ اسی بات کے ساتھ پھر بڑے طالب نے چھوٹے طالب کی

گردن پر تھپڑ رسید کر دیا۔

مولوی اعظم صاحب! چھوڑ دو بچے کو، غلطیاں ہم سے بھی ہوئی تھیں، جب ہم بچے

تھے۔۔۔ چھوڑ دو، ہم نے محنت اور خواری بھی تو کی ہے۔ مولوی اعظم نے جواب دیا۔

جاؤ ملک صاحب کے گھر سے لسی لے آؤ۔ مولوی اعظم نے چھوٹے طالب کو

دروازے کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔

چھوٹا طالب روتا ہوا مدرسہ سے جس میں ایک مسجد بھی تھی، ملک صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

یہ چھوٹا طالب عبد الولی تھا۔ جس کی عمر تقریباً سات سے آٹھ سال کے قریب تھی۔ گھر میں چار بھائی او دو بہنیں تھیں۔ والد گھر کا گزارا بڑی مشکل سے کرتا تھا۔ وہ دن بھر مزدوری کرتا اور اپنے چھ بچوں اور ایک بیمار بیوی کا پیٹ پالتا تھا۔ کبھی گھر میں چولہا جلتا تو کبھی فاتحہ کشی ہوتی۔ عبد الولی کے بھائیوں اور بہنوں کی جسمانی حالت ایسی تھی جیسے انہیں کھانے میں صرف ہوا اور پانی میسر ہوتا۔ گھر تھا مگر گھر کے نام پر کھنڈر نماد یو ایریں اور کمرے تھے۔ دو ہی تو کمرے تھے۔ اُس گھر، جس کے ایک کمرے کا دروازہ نہیں تھا اور دوسرے کمرے کا ایک کواڑ تھا تو دوسرا غائب، کمرے ایسے جس کی چھتیں گرنے کو تھیں۔ سردیوں میں سرد اور گرمیوں میں گرم۔ یعنی وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہنوں کے ساتھ ایک کھنڈر میں رہتا تھا۔ داد محمد پہلوان، عبد الولی کا والد سارا دن اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کیلئے محنت مزدوری کرتا وہ بھی اگر مل جاتی تو۔ داد محمد کا ایک بھائی جو اُس سے عمر میں چھوٹا تھا لعل محمد نام تھا۔ وہ دونوں سگے بھائی تھے، مگر لوگوں کا خیال تھا کہ ایک دوسرے کے ذور کے رشتہ دار ہونگے۔ باپ نے اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد کا بوارہ دونوں بھائیوں میں کیا تھا۔ باپ کے گزر جانے کے فوراً بعد دونوں علیحدہ ہو گئے۔ داد محمد پہلوان کو باپ نے خوشی خوشی زمینداری حصے میں دی تھی۔ داد محمد پہلوان کی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ زمینداری سنبھالے۔ اُسے حصے میں ایک کاریز • بھی ملی تھی۔ کاشت کاری کیلئے زمین اور پانی لعل محمد سے زیادہ اُس کے حصے میں آئیں تھیں۔ لعل محمد کو کچھ زمین اور اسی کاریز سے ایک وقت کا پانی باپ نے حصے میں دیا۔ مگر جس چیز نے آگے چل کر اس کے بچوں کا مستقبل تانباک بنا یا وہ تھی

• کاریز: زمین کے نیچے قدرتی پانی کا ایک مصنوعی راستہ۔

ایک دکان، جو لعل محمد کو باپ نے وراثت میں دی تھی۔ گاؤں سے تقریباً بیس کلو میٹر کے فاصلے پر شہر میں واقع اس دکان کا مالک لعل محمد بنا۔

وقت گزرتا گیا، حالات نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ خشک سالی آئی، اور ایسی آئی کہ پانی کا نام و نشان تک نہ رہا۔ کاریزات، چشمے، سب خشک ہو گئے، داد محمد پہلوان کو نقصان پر نقصان اٹھانا پڑا۔ آخر مجبور ہو کر اُس نے تھوڑی تھوڑی زمین بیچنی شروع کر دی۔ لعل محمد نے دکانداری میں نام کمانا شروع کیا۔ تھوڑے سے عرصے میں لعل محمد مالی طور پر اتنا مستحکم ہوا کہ اُس نے اپنے بھائی کی زمینیں جو وہ بیچ چکا تھا واپس خریدیں۔ دونوں بھائیوں کے گھر ایک ہی گلی میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ داد محمد پہلوان کے گھر کا دروازہ نہیں تھا، مگر لعل محمد کے گیٹ جیسا پورے گاؤں میں نہیں تھا۔ داد محمد پہلوان، لعل محمد سے عمر میں بڑا تھا مگر لعل محمد اپنے آپ کو بڑا سمجھتا۔ داد محمد پہلوان بھی اُسے بڑا سمجھتا۔ لعل محمد اپنے بڑے بھائی کو بھائی کی نظر سے نہیں بلکہ ایک غریب ہمسائے کی نظر سے دیکھتا۔ لعل محمد اپنے بچوں کو ہمیشہ یہی تلقین کرتا کہ پہلوان کے بچوں کے ساتھ زیادہ کھیل کود مت کرنا۔ اُس نے اپنے دادا کی جائیدادیں بیچ دیں، خدا خبر کہ اُس کی اولاد کیا گل کھلائے گی۔ لعل محمد نے اپنے بڑے بیٹے سلیم کو سائیکل خرید کر دی تھی۔ جس پر وہ سکول آتا جاتا۔ سکول کے بعد شام کو وہ سائیکل پر گاؤں کے چکر لگاتا۔ سلیم کے دوست وہ تھے جن کی کچھ مالی حیثیت تھی۔ عبد الولی جتنا اُس کے قریب جاتا وہ اتنا ہی اُس سے ڈور رہتا۔ ڈور رہنا تو اپنی جگہ وہ دوسرے دوستوں کے ساتھ ملکر عبد الولی کا مذاق اڑاتا۔

داد محمد پہلوان جسے کسی چیز کی بھی فکر نہیں تھی، جس دن وہ رات کا نوالہ کھاتا تو اُس دن اُس کی عید ہوتی۔ نہ اُسے بچوں کے کپڑوں کا خیال اور نہ ہی جو توں کا خیال۔ اگر خیال تھا تو اُس کی بیوی کو تھا۔ وہ کپڑے سیتی اور بچوں کیلئے کپڑوں اور جو توں کا انتظام کرتی۔ مگر آجکل وہ بھی بیمار بیمار سی رہنے لگی تھی۔ صرف کڑھائی کا کام جو کہ تھوڑا آسان بھی تھا کرتی۔

بچوں کی فطرت ایسی ہوتی ہے کہ وہ باپ سے زیادہ ماں کے قریب ہوتے ہیں۔ وہ باپ کے سامنے بلا ہجک بات نہیں کر سکتے مگر ماں سے اپنی ہر خواہش کا اظہار بلا تامل کرتے ہیں۔ عبد الولی جب چھوٹا تھا تو اس کی ماں خال دارہ کا بھی دل چاہ رہا تھا کہ وہ اُسے بھی کسی سکول میں داخل کروائے۔ وہ بھی سکول جا کر تعلیم حاصل کرے، جیسے اُس کے چچیرے بھائی جاتے ہیں۔ یہ ارمان ایسا پورا ہوا کہ عبد الولی سکول کی بجائے درس و تدریس کیلئے مدرسہ میں داخل ہوا۔ عبد الولی کی خواہش جو اُسے دل ہی دل میں کھائے جا رہی تھی یہ تھی کہ وہ بھی اپنے چچیرے بھائیوں کی طرح سکول جائے۔ اُس کے پاس بھی ایک سائیکل ہو، وہ بھی اچھے اچھے کپڑے پہنے، مگر یہ ایک ایسا خواب تھا جس کی تعبیر عبد الولی کو نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود عبد الولی با احساس اور ہونہار لڑکا تھا۔ داد محمد پہلوان کے بھائی لعل محمد کے دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ سلیم بڑا لڑکا تھا۔ لعل محمد گرچہ ناخواندہ تھا مگر وہ کچھ لکھ پڑھ سکتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد دونوں بھائیوں میں بٹوارہ ہوا۔ لعل محمد کا بیٹا سلیم عبد الولی سے دو سال چھوٹا تھا۔ لعل محمد کو وراثت میں ایک دکان جو کہ شہر میں تھی ملی تھی۔ وہ صبح دکان جاتا، اور شام کو واپس لوٹ آتا۔ کچھ عرصہ وہ بسوں میں جاتا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس نے ایک موٹر سائیکل خرید لی۔ اُس نے اپنے بڑے بیٹے سلیم کو بھی شہر کے ایک سکول میں داخل کروا لیا جسے وہ اپنے ساتھ آتا لے جاتا۔ ترقی لعل محمد کے نصیب میں تھی، موٹر سائیکل سے وہ گاڑی کا مالک بن گیا۔ جیسے ہی دوسرا بیٹا چلنے پھرنے کے قابل ہوا اُسے بھی اپنے ساتھ شہر لے جاتا۔ کچھ عرصے کے بعد اُسے بھی شہر کے سکول میں داخل کروا لیا۔ لعل محمد کی بیوی ایک ایسی عورت تھی جو خود تو دُور اپنے شوہر کو بھی اُس کے بھائی کے گھر سے دُور رکھتی۔

خوشی کے موقع پر تو وہ داد محمد پہلوان اور اُن کی بیوی بچوں سے ایسا کام لیتی جیسے وہ اُن کے اپنے نہیں بلکہ کرائے کے مزدور ہوں۔

توبہ ہے میری توبہ۔۔۔۔۔ میرے باپ کی بھی توبہ۔ داد محمد اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے۔

تو پھر ٹھیک ہے، کل اُس کے کپڑے کسی گٹھڑی میں باندھ کر اُسے میرے پاس بھیج دو۔ مولوی صاحب یہ کہتے ہوئے روانہ ہو جاتے ہیں۔

ٹھیک ہے مولوی صاحب، جیسا آپ کہتے ہیں ویسا ہی ہو گا۔

داد محمد پہلوان کا گاؤں آبادی کے لحاظ سے چھوٹا تھا۔ تقریباً پچاس ساٹھ گھر تھے۔ گاؤں میں ایک مسجد تھی جس میں ایک پیش امام۔ پیش امام کیلئے گاؤں کے لوگوں نے مسجد کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا گھر بنا کر دیا تھا جس میں پیش امام اپنے بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ مسجد میں بڑا بیٹا بچوں کو درس دیتا اور چھوٹا بیٹا ہر شام گھر کیلئے وظیفہ اکھٹا کرتا۔

مسجد کے سامنے صاف پانی کا ایک نالہ بہتا تھا، جو کہ اصل میں کاریز کا پانی تھا۔ اب اُس نالہ میں پانی نہیں بہ رہا تھا۔ کاریز خشک ہو گئے تھے۔ نالے کے کنارے توت کے درختوں کے قطار کھڑے تھے۔ جو کہ اسی پانی سے سیراب ہوتے، مگر آجکل توت بھی پیاسے نظر آرہے تھے، سردیوں میں، یہ صاف پانی کا نالہ پھر بھر جاتا تھا۔ توت کے درخت سردیوں میں اپنی پیاس بجاتے اور گرمیوں میں پھر پیاسے باران رحمت کے منتظر رہتے۔

جب کسی وقت اس نالہ میں پانی کافی مقدار میں بہ رہا تھا تو لوگ نالہ کے کنارے توت کے درخت کے سائے میں آرام کرتے۔ اسی نالہ سے پینے اور وضو کا پانی استعمال میں لاتے۔ اسی نالہ پر مرد حضرات غسل بھی کیا کرتے، یعنی یہ نالہ پورے گاؤں کے مردوں کیلئے حمام کی حیثیت رکھتا تھا۔ عورتوں کیلئے نالہ پر تھوڑا اوپر کی طرف پانی بھرنے اور کپڑے دھونے کیلئے جگہیں بنائی گئیں تھیں۔

عصر کی نماز کے بعد گاؤں کے عمر رسیدہ بزرگ افراد مسجد کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ لگاتے۔ بعض لوگ مسجد سے کچھ دور بیٹھ کر دیسی شطرنج جو کہ زمین پر بنائی جاتی، کھیلتے۔

اب جبکہ کاریز خشک ہو گئی تھی تو یہ تمام سلسلے بھی ختم ہو گئے تھے۔ اب نہ وہاں لوگوں کے جگمگے تھے اور نہ ہی ٹھنڈا پانی۔ جن لوگوں کی مالی حیثیت کچھ ٹھیک تھی انہوں نے اپنے لیے ٹیوب ویل لگوا لیے تھے۔ اور جن لوگوں کی مالی حیثیت کمزور تھی انہوں نے ٹیوب ویل کے مالکان سے زمینوں کی کاشت کاری کیلئے پانی کا ایک حصہ اجارے پر لیا تھا۔ تمام گاؤں میں دس یا پندرہ ایسے افراد تھے جو کہ مالی لحاظ سے مستحکم تھے۔ باقی تمام داد محمد پہلوان کی طرح گزارے پر اکتفا کرتے۔ گاؤں کے ساتھ ہی شہر کیلئے ایک پکی سڑک جاتی تھی۔ گاؤں کے لوگوں نے سڑک کے کنارے ایک اڈہ بھی بنالیا تھا جہاں عطاء قصاب کی دکان تھی۔ عطاء قصاب شہر سے گوشت لاکر گاؤں میں بیچتا۔ دوسرے گاؤں کی بیسیں اس اڈے پر رکتیں۔ گاؤں میں تقریباً پندرہ سے بیس ایسے گھر تھے جن کے دروازے تھے۔ باقی تمام گھروں کے دروازے نہیں تھے۔ پورے گاؤں میں صرف ایک ہی دکان تھی جو کہ خیر و پوئگی کے نام سے مشہور تھی۔ ایک ہی پرائمری سکول تھا جہاں صاحب حیثیت لوگوں کے بچے پڑھنے جاتے۔ سکول کے بچوں سے زیادہ بچے مسجد قاعدہ پڑھنے جاتے۔ جو بچے مسجد پڑھنے نہیں جاتے تو والدین انہیں بُرا بلا کہتے۔ مگر سکول کے معاملے پر خاموش رہتے۔ سکول میں صرف دو استاد (ماسٹر) تھے جو کہ دوپہر کے قریب تھوڑی دیر کیلئے آتے اور باقی سارا دن اپنی زمینوں میں کاشت کاری کرتے۔ جیسے ہی سکول پہنچنے تو کسی بچے کو چائے لانے کیلئے بھیجتے۔ پھر اُس کے بعد تھوڑی دیر سبق اور پھر لسی کا دور چلتا۔ پڑھائی سے زیادہ سکول میں کھانے پینے کا رواج تھا۔

خال دارہ، جس کے جگر کا ٹکڑا اُس سے جدا کیا جا رہا تھا، پہلوان کی بیوی تھی۔ وہ ناچاہتے ہوئے بھی اپنے شوہر پہلوان کے فیصلے کے آگے مجبور تھی۔ دل پر بوجھ رکھے اُس نے عبد الولی کے کپڑوں کی ایک چھوٹی گھڑی تیار کر کے عبد الولی کو چوما۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر گھر کے صحن تک اُس کے ساتھ آئی۔ آنکھوں میں آنسو لیے اپنے بیٹے کو باپ کے حوالے کیا۔ پہلوان عبد الولی کو لیکر سیدھا مولوی صاحب کے پاس لے گیا۔

دوماہ گزر گئے کہ عبد الوالی کو اس مدرسہ نما مسجد میں آئے ہوئے۔ گاؤں کے ہر گھر سے واقف ہو چکا تھا۔ دوپہر کو گاؤں کے ایک حصے سے اور شام کو دوسرے حصے سے وظیفہ اکٹھے کرتا۔ صبح سویرے قرآن گود میں گاؤں کے بچوں کے ساتھ پڑھنے بیٹھ جاتا۔ برتن دھونا، وظیفہ اکٹھے کرنا، جھاڑو پوچھا لگانا یہ سب عبد الوالی کے تمام دن کے کام کاج میں تھا۔ مگر پڑھائی وہ تو صرف نام کی تھی۔ عبد الوالی کا دل نہیں چاہتا کہ وہ مدرسہ میں رات گزارے، گھر کے افراد ماں، بھائی، بہن خاص طور پر سب سے چھوٹی بہن گل پانزا بہت یاد آتی۔ رات کو اپنے بستر میں چھپ کر رونا اور روتے روتے سوجانا عبد الوالی کا معمول بن گیا تھا۔ صبح سویرے جاگتا، بڑے طالبان کے لئے چائے بنانا جو کہ اس مدرسہ نما مسجد میں مولوی سے درس لیتے تھے اور پھر شام کو گاؤں کے بچوں کو بھی پڑھاتے تھے۔ عبد الوالی ان کے خدمت میں لگ جاتا۔

گاؤں کے لوگ ان طلباء کو کبھی کبھی جیب خرچ بھی دیتے۔ مولوی صاحب کو زکوٰۃ، خیرات، صدقات ملتی۔ وظیفے سے جمع کی گئی روٹی کو سوکھا کر وہ بیچ دیتے اور وہ روپے مولوی صاحب اپنے پاس رکھتے۔ عبد الوالی کا ناشتہ سوکھی روٹی اور چائے کے ساتھ تھا۔ پھر قرآن مجید لے کر وہ مسجد یا مسجد کے صحن میں بیٹھ جاتا۔ ایک بڑا طالب اُسے درس دیتا۔ کچھ دیر بعد گاؤں کے بچے آتے تو عبد الوالی ان کے ساتھ مل کر پڑھتا، گاؤں کے ان بچوں میں ایک بچی جس کا نام زرقا تھا گاؤں کے ملک صاحب کی بیٹی تھی۔ بڑے طالب کو سبق سنانے سے پہلے وہ عبد الوالی سے پوچھتی، اکثر اوقات اُسے سبق یاد نہیں رہتا۔ اس لیے وہ عبد الوالی کے پاس ہی بیٹھتی۔ زرقا کبھی کبھی کھانے کی کوئی چیز اپنے ساتھ لے آتی تو عبد الوالی کے ساتھ مل بانٹ کر کھاتی۔ جب عبد الوالی زرقا کے گھر وظیفہ لینے جاتا تو زرقا اپنی ماں سے کہتی کہ یہ طالب بہت اچھا ہے۔ جب بھی مجھے سبق یاد نہیں ہوتا یہ مجھے یاد کرتا ہے۔ زرقا کی ماں بھی عبد الوالی کے ساتھ پیار اور محبت سے پیش آتی۔ اس پیار و محبت کی وجہ سے عبد الوالی کو اپنی ماں کی یاد بہت ستاتی۔ عبد الوالی کی زندگی بھی عجیب زندگی

تھی۔ وہ پیار و محبت سینے میں لیے جب وظیفے اکٹھے کر کے مسجد کی طرف روانہ ہوتا گاؤں کے بچے پیچھے سے نعرے لگاتے۔

طالب جب وظیفے اکٹھے کر لیتا ہے

منہ تھیلا بنا لیتا ہے

پیٹ بوری بنا لیتا ہے

خدا کرے کہ طالب مر جائے۔

عبدالولی ان بچوں کے ساتھ لڑتا، کبھی اس لڑائی میں سر زخمی تو کبھی منہ سے خون بہنے لگتا۔ مسجد پہنچ کر بڑے طالب اُسے ڈانٹتے، پیٹتے۔ عبدالولی نے بھی بچوں سے لڑنا بند کر دیا، اور ان بچوں کی نشاندہی کرتا جو اُسے تنگ کرتے۔ مسجد میں وہ بڑے طالبان سے ان بچوں کی شکایت کرتا۔ بڑے طالب ان بچوں کو مزادیتے، گاؤں کی اکثر عورتیں عبدالولی کو بد دعائیں دیتیں۔

"کبخت! ہم نے تو اگرم کیا بھی نہیں ہوتا کہ تم سر پر کھڑے ہو جاتے ہو۔" بعض گھروں میں عبدالولی کی ہم عمر لڑکیاں عبدالولی کو تنگ کرتی۔ کبھی ٹوپی تو کبھی جوتے چپا لیتیں۔ یا پھر دور پھینک دیتیں۔ گاؤں کے کتے تو عبدالولی کے جانی دشمن بن گئے تھے۔

نہا عبدالولی سبق کے نام پر زندگی کے ہر موڑ پر جنگ جیسی حالت کا سامنا کر رہا تھا۔ پر دیسی کی جنگ، اپنے بس سے زیادہ کام کی جنگ، اور زیادہ تر لوگوں کی نفرت کے ساتھ جنگ۔ یہ وہ اتار چڑھاؤ تھے جو عبدالولی کی زندگی میں جنگ جیسی حالت کا سبب بن رہے تھے۔ پورے گاؤں میں اُس کا کوئی دوست نہیں تھا۔ ماسوائے زر قا اور اُس کی ماں کے۔ جو کہ ہر وقت عبدالولی کے ساتھ پیار و محبت سے پیش آتے۔

جب کبھی بھی گاؤں میں فونگی ہوتی تو عبدالولی وہاں خیرات کی گئی کھجور زر قا کے لیے مچھپاتا۔ عبدالولی زر قا کو جب کھجور دیتا تو وہ پوچھتی کہ یہ کیا ہے اور تمہارے پاس کہاں سے آئی؟ عبدالولی کہتا کہ گاؤں میں فونگی ہوئی تھی وہاں سے لایا ہوں۔

نہیں، میں یہ نہیں لوں گی۔

کیوں؟

امی کہتی ہے کہ فونگی کی خیرات کھانا اچھا نہیں ہوتا۔

کیوں اچھا نہیں ہوتا؟ میں بھی تو کھار ہا ہوں، مجھے تو کچھ نہیں ہوا۔

مجھے پتہ نہیں، بس امی کہتی ہے۔

پھر وہ عبد الولی سے کچھ لے لیتی۔ زر قا کو جب والد چیزیں خریدنے کیلئے پیسے دیتا تو

زر قا ان پیسوں سے پاپڑ اور کھانے کی چیزیں خرید لیتی، ان چیزوں میں عبد الولی کا حصہ ضرور ہوتا۔

جب کبھی عبد الولی زر قا کے گھر وظیفہ لینے جاتا تو زر قا وہ چیزیں عبد الولی کو دیتی۔ ان چیزوں کو دیکھ

کر بڑے طالب عبد الولی کو مارتے، پینتے کہ یہ تم ہماری جیبوں سے پیسے پڑا کر خریدتے ہو۔ عبد الولی

جسے جس مقصد کیلئے باپ نے بھیجا تھا وہ اُس کی بجائے خدمت کرنے میں مصروف تھا۔ مہینے میں

صرف ایک مرتبہ وہ جمعرات کی شب گھر جاتا، باقی تین جمعے وہ مسجد میں گزارتا، جمعہ کی شب اکثر

دوسرے مساجد کے طالبان اُن کے مسجد بانڈار (محفل) سجانے آتے۔ یا پھر عبد الولی کے مسجد کے

بڑے طالبان وہاں جاتے۔ طالبان کی محفل بڑی ہی دل فریب ہوا کرتی تھی۔ ایک جمعہ کی شب جب

عبد الولی اس مسجد میں نیا نیا آیا تھا تو ایک محفل سچائی گئی تھی۔ قرب و جوار کی مسجدوں سے کافی

طالبان آئے تھے۔ اس دن عبد الولی ہر ایک گھر سے دو دو روٹی وظیفہ لایا تھا۔ رات کو جب محفل

سچی تو عبد الولی بھی اس محفل سے کافی محفوظ ہوا۔

ملا پائیدین اخوند جو اس طرح کی محفلوں کیلئے بہت مشہور تھے درمیانی داڑھی، بڑے

عمر کے طالب تھے۔ گاؤں کے نوجوان عشاء کی نماز کے بعد مسجد کے ایک کمرے جسے حجرہ کہتے ہیں

بڑی تعداد میں آئے۔ ایک طالب بڑا تھا لے کر بیٹھ گیا دوسرے طالب نے چادر سے بنا ایک بڑا

ٹین کاڈبا اٹھایا اور چار طالبان تالیاں بجاتے ہوئے ملا پائیدین اخوند نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔ کلام

کے پہلے اشعار کچھ اس طرح تھے۔

بادشاہ نے کہا وزیروں میرے پہلوانوں
شیر کے ہاتھ باندھ دو اور اسے اس طرف کھینچ لاؤ
یہ سر اس کے تن سے جدا کرو
یہ کلام کے پہلے بول تھے جو تمام طالبان اسے ٹکرا کر کیا کرتے۔

جب پہلے بول بولے جاتے تو اس کے بعد ملا پائیدین اخوند اپنا کلام شروع کرتا۔ کافی
دیر تک کلام گائے گئے۔ اس کے بعد عبدالولی بڑی کیتلی میں چائے لے آیا۔ چائے کے ساتھ ساتھ
دیگر طالبان نے بادشاہ اور وزیر کا کھیل شروع کیا۔ ایک طالب جس نے بڈٹی کے ذریعے فال نکالا وہ
بادشاہ بنا۔ دوسرا وزیر۔ اسی طرح بڈٹی • (بڈی) سیدھی کھڑی ہو جاتی تو وہ گھوڑا یعنی بادشاہ کہلاتا۔
اگر چلی سائیڈ پر کھڑی ہو جاتی تو وہ گدھا یعنی وزیر کہلاتا۔ اور اگر تیسرے رخ پر پڑی رہتی تو بکری
یعنی چور کہلاتی۔ جو طالب بھی چور بنتا تو وزیر اُسے بادشاہ کے سامنے یوں پیش کرتا۔

بادشاہ بادشاہ! چوری ہوئی۔

کس نے کی؟ بادشاہ نے پوچھا۔

فلانے نے کی۔ کسی کا نام لے لیتا۔

پکڑا گیا ہے؟ بادشاہ نے پوچھا۔

ہاں پکڑا گیا ہے! جناب عالی۔

سزا دے دو۔

کوئی؟

کمرے سے باہر نکل جائے اور کئی مرتبہ جلدی جلدی یہ کہے۔

کچھ پاڑ پیکہ پاڑ، کچھ پاڑ پیکہ پاڑ، کچھ پاڑ پیکہ پاڑ، کچھ پاڑ پیکہ پاڑ

• بڈٹی: بکرے یا بچر دو بے کے پیر کی جوڑی ایک مخصوص چھوٹی بڈی۔

جب وہ یہ الفاظ جلدی جلدی کہتا تو اس سے جلد بازی میں غلطی ہو جاتی جس پر تمام طلباء زور زور سے ہنستے، اسی طرح چور کو ڈرے بھی پڑتے۔ وہ اپنے چادر سے ایک ڈرا بناتے اور چور کے تلووں پر زور زور سے مارتے۔ گرچہ چور کو تکلیف ہوتی مگر شرم کے مارے وہ منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتا۔ یہ کھیل اسی طرح تھوڑی دیر چلتا رہا پھر کھیل کے ختم ہونے پر محفل پھر سے جم جاتی۔ محفل کے دوران قبوہ چائے کا دور چلتا۔ اسی دوران گاؤں کے ایک نوجوان نے ملا پائیدین سے پوچھا کہ

ملا پائیدین اخوند! لوگ کہتے ہیں کہ پُرانے وقتوں کے طالبان اس سے اچھی محفل سجاتے آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

بالکل صحیح کہتے ہیں۔ محفل تو اب صرف نام کی رہ گئی ہے۔ پچھلے دور میں طالبان صرف محفل ہی نہیں اور بھی بہت کچھ کیا کرتے تھے۔ آجکل تو وہ طالبان بھی نہیں رہے۔ پچھلے دور میں ایک گاؤں کے طالبان دوسرے گاؤں سے خشک گوشت (لانڈی) چُرا کر لے آتے۔ ملا پائیدین نے جواب دیا۔

وہ کیسے؟ ایک دوسرے بیٹھے جوان نے پوچھا۔

وہ اس طرح کہ جب کسی گاؤں میں خشک گوشت بنایا جاتا تو دوسرے گاؤں کے طالبان اس گاؤں کے طالبان سے کہتے کہ آپ لوگوں کے گاؤں میں فلاں کے گھر پر تین خوشے خشک گوشت بنا ہوا ہے ہم تین دنوں میں ایک خشک خوشہ چُرا کر اپنے گاؤں لے آئیں گے۔ آپ لوگوں کو خبر ہو۔

پھر اس گاؤں کے طالبان جاتے اس گھر سے ایک خوشہ چُر لیتے۔ اگر وہ اپنی مسجد تک گوشت کا خشک خوشہ لے آتے تو وہ خشک گوشت کا خوشہ ان کا ہو جاتا اور دوسرے گاؤں کے طالبان ان کیلئے دعوت بھی کرتے۔ اور اگر پکڑے جاتے تو خشک گوشت کے خوشے کے ساتھ ساتھ جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا۔ اس کھیل کے متعلق گاؤں کے لوگوں کو بھی پتہ ہوتا بلکہ گاؤں کے

جوان بھی طالبان کے ساتھ اس کھیل میں شریک ہوتے تھے۔ یہ کھیل عموماً موسم خزاں کی سرد اور چاندنی راتوں میں ہوا کرتا تھا۔

طالبان میلوں میں اپنے جھنڈے گاڑتے، وہ لوگ رقص کرتے، میلے کے تیسرے دن جب شام کو طالبان اپنا رقص کرتے تو اس کے ساتھ ہی میلہ بھی اختتام پذیر ہوتا۔

اب یہ سب کچھ کیوں نہیں ہوتا؟ نو جوان نے پوچھا۔

آجکل میلے کہاں ہیں۔ میلے تو گلستان اور چمن کے مشہور میلے تھے۔ اور بھی تھے مگر یہ دونو بہت مشہور تھے۔ دور دور سے لوگ یہ میلے دیکھنے کیلئے آتے، میں خود چمن کا میلہ دیکھنے بہت جاتا۔ یہ پشین ضلع میں ہوا کرتا تھا۔ ملکیار اور منرکی کے درمیان جو چھوٹی ندی ہے یہاں ہوا کرتا تھا۔ ارد گرد کے علاقوں کے لوگ تین دن تک نزدیک کے گاؤں میں میلہ دیکھنے کیلئے رہائش پذیر ہوتے۔ صبح وہ میلہ دیکھتے اور رات کسی نزدیک گھر میں گزارتے۔ میلے میں انڈے لڑائے جاتے، بڑے بڑے شامیانے کھڑے ہوتے، آخری دن پہلوانی ہوتی، گھوڑ دوڑ، وغیرہ وغیرہ۔ بہت کچھ ہوتا اب تو نہ میلے ہیں نہ وہ لوگ اور نہ وہ طالبان۔ آجکل تو میلوں کی بجائے فساد ہی فساد ہے۔

(۳)

اس جیسے کو عبد الولی تین ہفتوں کے بعد گھر آیا۔ چھوٹی بہن گل پاٹرا کو گود میں لے کر
چہرے کے ایک طرف اور دوسری طرف چومنے لگا۔ ماں کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور ماں نے بھی
اُسے ماتھے پر چوما۔ گل پاٹرا جو کہ اب دو سال کی ہو گئی تھی اُس کی گود میں بیٹھی تھی کہ ماں نے
پوچھا۔

طالب! تم کیا کہہ رہے تھے؟

عبد الولی کو آجکل گھر میں طالب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

میں کہہ رہا تھا کہ میں مزید اس مسجد میں نہیں پڑھوں گا، عبد الولی نے کہا۔ عبد الولی نے

اس مسجد نما مدرسہ میں سال کے قریب وقت گزارا تھا۔

کیوں نہیں پڑھو گے، کیا ہوا؟ ماں نے پوچھا۔

یہاں تو صرف مجھ سے وظیفے اکٹھے کرائے جاتے ہیں یا پھر لسی جمع کرنی پڑتی ہے۔

عبد الولی نے کہا۔

تو کیا ہوا سبق بھی تو پڑھا رہے ہیں۔ ماں نے کہا۔

خاک سبق پڑھا رہے ہیں۔ بڑے طالب ہم پر بادشاہی کرتے ہیں، گھروں کے بچے

تنگ کرتے ہیں، لڑائی کرتے ہیں، عورتیں تو ایسی ہیں جیسے میں اُن سے بھیک مانگتا ہوں۔ عبد الولی

نے ماں کو اپنی مشکل بتادی۔

تو پھر کرو گے کیا جو سبق نہیں پڑھو گے؟۔ ماں نے پوچھا۔

سبق پڑھوں گا مگر مدرسہ میں۔ وہاں ایک طالب کہہ رہا تھا کہ مدرسہ اس جگہ سے اچھا

ہے، وہاں اچھا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

یہ بھی تو مدرسہ ہے۔ ماں نے کہا۔

کس نے کہا؟ مسجد ہے مدرسہ کہاں سے ہوا۔ عبد الولی نے کہا۔

مدرسہ میں اس طرح نہیں ہوگا؟ ماں نے پوچھا۔

مجھے پتہ نہیں کہ کیسے ہوگا، مگر اُس دن وہ طالب کہہ رہا تھا کہ مدرسہ مسجد سے اچھا ہے۔ بندہ صرف اپنی پڑھائی پر دھیان دیتا ہے۔ ماں! وہاں قرآن شریف زبانی یاد کرایا جاتا ہے۔ میں بھی قرآن شریف حفظ کرونگا۔ عبد الولی نے کہا۔

یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تم قرآن شریف حفظ کرو، مگر پھر کیا کروگے؟ ماں نے پوچھا۔

کیا کرونگا، تراویح میں پڑھاؤں گا۔ لوگوں کو قرآن شریف کی تراویح دوں گا۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

میں قربان جاؤں۔ بیٹا قرآن شریف لوگ تراویح کیلئے حفظ نہیں کرتے، قرآن کو سمجھنے کیلئے حفظ کرتے ہیں تاکہ پھر دوسرے لوگوں کو سمجھائے۔ ماں نے کہا۔

تو پھر میں مدرسہ جاؤں؟ عبد الولی نے ماں سے پوچھا۔

تم ٹھہرو، تمہارے ابو آئیں تو وہ کیا کہتے ہیں۔

انہیں نہ کہیں، وہ پھر مولوی صاحب سے کہیں گے، مولوی صاحب نے تو اسی خدمت کیلئے مجھے مسجد بھیجا تھا۔ وہاں کا مولوی اس مولوی کا دوست ہے۔ وہاں کوئی دوسرا چھوٹا طالب نہیں ہے جو وظیفے اکھٹی کر سکے۔ عبد الولی نے کہا۔

تم کیسے جاؤ گے، تمہیں مدرسہ کا پتہ معلوم ہے؟ ماں نے پوچھا۔

ہاں اُس دوسرے طالب کے ساتھ جاؤنگا، اُس نے مجھ سے کہا ہے۔ عبد الولی نے

جواب دیا۔

جیسے تمہاری مرضی، میں کیا کر سکتی ہوں۔ ماں راضی ہو گئی۔

دوسرے دن عبد الولی نے ماں سے رخصت لی اور چلا گیا۔ مسجد سے اپنا بستر چھپا کر دوسرے بڑے طالب کے ساتھ مل کر مدرسہ کی جانب روانہ ہوا۔ یہ مدرسہ بڑے مدرسوں میں

سے نہیں تھا، نسبتاً اُن سے تھوڑا چھوٹا تھا۔ دور دراز علاقے میں تھا اور ارد گرد کے گاؤں کے بچے بھی یہاں پڑھنے آتے تھے۔ ساٹھ کے قریب طالب یہاں رہائش پزیر تھے۔ یہاں سے عبد الولیٰ کا گاؤں کافی دور تھا۔ مدرسہ عام سڑک سے بھی تین میل دور تھا۔ لیکن قریب ہی ایک دو گاؤں تھے۔ عبد الولیٰ مدرسہ میں ۱۴ طالبان کے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہ رہا تھا۔ مدرسہ میں کل دس کمرے تھے جن میں تین استادوں کے اور ایک کمرہ جو کہ مہتمم کے گھر سے لگا ہوا تھا مہتمم کا تھا۔ بقیہ ہر کمرے میں اسی طرح کی تعداد سے طالب رہ رہے تھے۔ مدرسہ کے تمام کمرے جنہیں حجرہ بھی کہتے ہیں مٹی کے بنے کچے کمرے تھے۔ بانس اور چٹائی سے اُن کے چھت ڈھکے تھے۔ صحن کچا تھا۔ ہر کمرے میں طالبان کے بستے پڑے ہوتے جن کے سر اپنے بکس، گھٹڑی (پوٹلی) پڑے ہوتے۔ جن میں طالبان کے کپڑے یا ضرورت کی اور اشیاء پڑی ہوتی۔ ایک چادر کی ٹینکی جس میں کچھ نلکے لگے ہوئے تھے مدرسہ کے ایک کونے میں پڑی ہوئی تھی۔ پینے کا پانی یہاں سے لیتے اور وضو بھی اسی ٹینکی سے کرتے۔ پورے مدرسہ میں دو استنجاخاں تھے۔ مگر بڑی حاجت کیلئے طالبان کو مدرسہ سے باہر دور میدان میں جانا پڑتا۔ وہ اس لیے کہ مدرسہ میں بیت الخلا کا انتظام نہیں تھا۔ جب کبھی غیر اراد تا کسی سے بھی استنجاخاں میں بڑی حاجت ہو جاتی تو پھر چھوٹے طالبان کی خیر نہیں ہوتی۔ استاد اُن سے وہ استنجاخاں صاف کرواتے اور کان بھی پکڑوا لیتے۔ مدرسہ کی کمروں میں نہ تو گرمی کیلئے پنکھے اور نہ سردی کیلئے انگلیٹھی کا انتظام تھا۔ گرمیوں میں دوپہر کو طالبان اپنے چادر کو بھگو کر اپنے اُوپر ڈالتے اور پھر سوتے۔ اور سردیوں میں وہ اپنے بستروں میں بیٹھے رہتے۔ لیکن مدرسہ کے مہتمم کے کمرے میں دونوں چیزیں موجود تھے، پنکھا بھی اور انگلیٹھی بھی۔ چھوٹے ہوں یا بڑے گاؤں کے زیادہ تر مدارس اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ حفظ کرنے والے طالبان تقریباً ایک ہی عمر کے تھے۔ جب عبد الولیٰ سے قرآن شریف سنا گیا تو استاد نے عبد الولیٰ کو مشورہ دیا کہ تم پہلے قاعدہ ختم کر لو پھر قرآن شریف حفظ کر لینا۔ عبد الولیٰ خوش ہوا کہ اب صحیح جگہ پہنچا ہوں مگر عبد الولیٰ کی یہ خوشی اُس وقت ختم ہوئی جب اس کے کمرے کے ایک طالب نے عبد الولیٰ سے کہا

کہ آج شام میں اور تم نزدیک کے گاؤں و ضلع اکٹھا کرنے کیلئے جائیں گے۔ عبد الولی پھر سے اپنے پرانے کام پر لگ گیا، مگر اس دفعہ وہ ہفتہ میں صرف ایک دن وظیفہ اکٹھی کرنے جاتا۔

اس مرتبہ عبد الولی چار مہینوں کے بعد گھر آیا۔ گل پانزا نے بھی کچھ کچھ باتیں سیکھیں تھیں۔ عبد الولی اُس کے ساتھ اُس کی تو تلی زبان میں باتیں کرتا، پہلے پہلے تو گل پانزا کو عبد الولی اجنبی سا لگ رہا تھا، مگر ایک رات گزرنے کے بعد جُدا ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ عبد الولی جب صبح کی چائے پی رہا تھا تو پاس کے مسجد میں اعلان ہوا کہ فلاں شخص وفات پا چکا ہے لہذا سب قبرستان میں حاضر ہو جائیں۔ چائے کے بعد عبد الولی گھر سے باہر نکلا کہ قبرستان جائے۔ چچا اپنی گاڑی کے پاس گھر کے ساتھ کھڑا تھا۔ عبد الولی اُن کے پاس سلام و دعا کرنے کیلئے گیا۔

السلام علیکم چچا!

وعلیکم السلام۔ کب آئے ہو۔ تم نے پھر پگڑی باندھ لی؟ چچا نے بدینتی کی انداز میں

پوچھا۔

کل ہی آیا ہوں۔ عبد الولی نے جواب دیا۔ مگر چچا کی بات ناگوار گزری۔ اسی وقت سلیم اور اُس کا چھوٹا بھائی سکول کے یونیفارم پہنے گھر سے نکلے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ عبد الولی کو دیکھا مگر حال احوال نہیں پوچھا۔ سلیم نے اپنے بھائی کے کان میں کچھ کہا پھر دونوں عبد الولی کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے۔ عبد الولی شرمندہ سا ہوا کہ یہ کیوں مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ اسی وقت ایک شخص آیا اور لعل محمد سے کہنے لگا۔

جانو چاچا وفات پا چکے ہیں، آپ کیا کر رہے ہو؟

میں کسی کو دیکھتا ہوں کہ بچوں کو سکول پہنچائیں اُس کے بعد قبرستان آؤنگا۔ عبد الولی قبرستان کی طرف روانہ ہوا، قبرستان میں مولوی صاحب نے قرآن کے پارے دیے کہ یہ لوگوں میں تقسیم کرو تا کہ لوگ پڑھیں۔ جس وقت عبد الولی کا چچا آیا تو عبد الولی اُس کے لیے سپارہ لے گیا۔ جب عبد الولی نے سپارہ آگے کیا تو چچا نے ذرا ٹرٹس ہو کر پوچھا۔

اس کا کیا کروں؟

میرا خیال تھا کہ آپ پڑھیں گے۔ عبد الولی نے کہا۔

چھوٹے لڑکے ہو، تمہیں کس نے کہا کہ قبرستان آجاؤ۔ یہ پگڑی باندھی اسی لیے ہے کہ کوئی تمہیں کچھ دے سکے۔ باپ تو کچھ کہتا نہیں ہمیں شرمندہ کر رہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ لعل محمد کا بھتیجا بھیک مانگنے آیا ہے۔ لعل محمد نے عبد الولی کو غصے سے کہا۔

اس میں بھیک مانگنے کی کیا بات ہے۔ ہم طالب یہ کام ہر جگہ کرتے ہیں۔ یہ تو آپ کا کام ہے ہم تو یہ پیسوں کیلئے نہیں کرتے۔ عبد الولی نے کہا۔

اپنی زبان بند کرو۔ جاؤ یہ ثواب کہیں اور کماؤ۔ اس گاؤں میں یہ کام تم نہیں کرو گے۔ ثواب کے نام پر پیسے بنورتے ہو۔ چچا نے اور غصے سے کہا۔

قریب بیٹھے ایک شخص نے کہا، لعل محمد کیوں غصہ کر رہے ہو۔ یہ تو ثواب کا کام ہے۔ آپ چھوڑیں اس بات کو، کل کو یہ اس کی عادت بن جائے گی۔ لعل محمد نے کہا۔ عبد الولی کو اپنے چچا کی باتیں ناگوار گزریں۔ اُس نے سپارے واپس رکھ دیے اور گھر کی طرف چل پڑا۔ جب گھر پہنچا تو بہت ہی ناراض تھا۔

کتنی جلدی دفنا دیا۔ ماں نے پوچھا۔

ابھی تک نہیں دفنایا۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

تو پھر کیوں آئے اور یہ تمہارا چہرہ کیوں اتر اہوا ہے؟ ماں نے پوچھا۔

چچا نے مجھے ڈانٹا۔ کہہ رہا تھا تم کیوں قبرستان آئے ہو۔ عبد الولی نے کہا۔

کیا ہوا جو اُس نے ڈانٹا۔ بڑے ہیں بڑوں کی ڈانٹ کا بُرا نہیں مانتے۔ ماں نے کہا۔

دوسروں کے سامنے کہا کہ تم بھیک مانگنے آئے ہو۔ کیا میں بھیک مانگنے گیا تھا۔ ایسے

دیکھ رہا تھا جیسے میں اُس کا دشمن ہوں۔ عبد الولی نے غصے اور رونے کے طے جلے لہجے میں کہا۔

میں صدقے جاؤں کوئی بات نہیں وہ بڑے ہیں۔ تم بیٹھو میں تمہارے لیے قہوہ چائے بنا کر لاتی ہوں۔ ماں نے پیار سے کہا۔

قہوہ چائے نے تو مدرسہ میں بھی پیٹ میں کھڑی بنائی ہے میٹھی چائے بنا کر لاؤ۔ عبد الولی نے ماں سے پیار میں کہا۔

تھوڑی سی چینی پڑی ہے وہ میں نے تمہارے ابو کی چائے کیلئے رکھی ہے، میں تمہارے لیے گڑ والی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ ماں نے کہا۔

جس چیز کی ہو لیکن میٹھی ہو۔ میں کونسا سلیم کی طرح مغرور ہوں۔ ماں! آج اُس نے میرے ساتھ حال احوال بھی نہیں کیا، اُلٹا مجھ پر ہنس رہا تھا۔ عبد الولی نے ماں سے کہا۔
کسی کی باتوں پر دھیان نہ دو اپنے سبق پر توجہ دو، وہ جو بھی کرتے ہیں تم اُس کی پرواہ مت کرو۔ ماں نے سمجھایا۔

سہ پہر کو عبد الولی گھر سے نکلا تو چچیرے بھائی بھی سکول سے آئے تھے۔ عبد الولی دکانوں کے سامنے گیا اور وہاں دوسرے لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ کچھ دیر بعد سلیم سائیکل چلاتا ہوا وہاں آیا اور اُن کے کھیل میں شریک ہوا۔ سائیکل کو دیوار کے ساتھ کھڑا کیا۔
میں تمہاری سائیکل چلاؤں؟ ایک لڑکے نے سلیم سے کہا۔

جاؤ چلاؤ، سلیم نے لڑکے کو اجازت دے دی۔ لڑکا سائیکل لے کر چلانے لگا، پھر وہ لے کر آیا تو عبد الولی نے سلیم سے کہا۔

میں تمہاری سائیکل چلاؤں؟

تمہیں سائیکل چلانا کب آتا تھا۔ سلیم نے کہا۔

سیکھ لو گا۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

جاؤ جاؤ اپنے پانچ مت پھڑواؤ اُس سے۔ بعد میں کس چیز سے سیوگے؟ سلیم اُس پر ہنسا اور لڑکے بھی اُس کے ساتھ ہنسے۔

یہ کیسی پگڑی ہے جیسے رسی۔ سلیم نے اُس کی پگڑی انگلی سے گراتے ہوئے کہا۔
ارے یار یہ تو گنجا ہے، اس نے کدو پر پگڑی باندھی ہے۔ سلیم نے ایک زوردار تھپڑ
اُس کے گنچے سر پر مارا۔

مت کرو یار، کیوں مار رہے ہو، لگتی ہے۔ عبد الوالی نے کہا۔
یہ پگڑی اپنی ماں کو دو تاکہ وہ کنویں سے پانی نکال سکے۔ ہر روز وہ ہمارے گھر سے لوٹا
اور رسی لے جاتی ہے۔ سلیم نے کہا۔

تمہیں میری پگڑی سے کیا کام۔ تمہاری طرح تو نہیں ہوں جو بغیر کچھ سر پر پہنے
پھر رہے ہو۔ عبد الوالی نے کہا۔

کیوں بغیر کچھ سر پر پہنے گناہ ہے؟ سلیم نے پوچھا۔
بالکل گناہ ہے، میرے استاد کا کہنا ہے کہ یہ کافروں کا شیوا ہے۔ عبد الوالی نے جواب

دیا۔

تمہارا کیسا استاد ہے، وہ کب استاد تھے، وہ تو مولوی ہیں۔ سلیم نے کہا۔
جو کسی کو سبق پڑھائے کیا وہ استاد نہیں؟ عبد الوالی نے پوچھا۔
تم تو مسجد میں پڑھتے ہو کونسا سکول میں پڑھتے ہو۔ سلیم نے کہا۔
کیا میں ایک بار تمہاری سائیکل چلاؤں؟ عبد الوالی سائیکل کے نزدیک ہوا۔ چھوڑو،
میری سائیکل سے دور ہو جاؤ۔ سلیم نے اُس کا ہاتھ پکڑا۔

کھا تو نہیں رہا ہوں، صرف دیکھ رہا ہوں۔ عبد الوالی نے کہا۔
نہیں، مت دیکھو، بھوکے کے بچے۔ سلیم نے کہا۔
دیکھو گا، بھوکا تمہارا باپ۔ عبد الوالی نے سائیکل کو دھکا دیا سائیکل ایک طرف گر گئی۔
سلیم نے عبد الوالی کو تھپڑ مارا، دونوں کی لڑائی شروع ہو گئی۔ لڑکوں نے دونوں کو چھڑایا۔ سلیم کے

چہرے پر عبد الولی کے ناخن کے نشان تھے۔ دونوں اپنے اپنے گھر گئے۔ تھوڑی دیر بعد سلیم کی ماں سلیم کو ہاتھ سے پکڑ کر عبد الولی کے گھر آئی۔

جب پال نہیں سکتی تو پیدا کس لیے کیے۔ اس بھوکے نے میرے بیٹے کا چہرہ زخمی کر دیا ہے۔ سلیم کی ماں نے غصے کے انداز میں عبد الولی کی ماں سے کہا۔

تم آؤ بیٹھ جاؤ، خدا سب خیر کرے گا۔ عبد الولی کی ماں نے کہا۔

میں بیٹھنے کیلئے نہیں آئی، ہمارے کلڑوں پر پلا بڑھا آج ہم پر بد معاشی کر رہا ہے۔ اچھا تھا کہ غائب تھا، بھاڑ میں جائے منحوس۔ سلیم کی ماں نے اب بددعا دینا شروع کیں۔

بہن! یہ تو اتنی بڑی بات نہیں، بچے آپس میں لڑیں گے تو کبھی آپس میں کھیلتے رہیں

گے۔

بالکل بھی میرے بچوں کے قریب نہ آئے۔ تم اس کے پیلے دانت، میلے ہاتھوں کو تو دیکھو اور میرے بیٹے کے ساتھ کھیلا دیکھو۔ سلیم کی ماں نے خال دارہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

تم میری بات تو سنو۔ خال دارہ نے کہا۔

باتیں چھوڑو، اگر میں نے سلیم کے ابا سے کہا تو نہ تم رہو گی اور نہ تمہارا یہ بھوکا رہے گا۔

سلیم کی ماں یہ کہتے ہوئے چلی گئی۔

خال دارہ کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو دکھائی دینے لگے۔ اُس نے اپنے دوپٹے کے

پلو سے اُسے صاف کیا۔ عبد الولی نے جب ماں کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اُس کے قریب ہوا۔

ماں! میں تو صرف اُس کی سائیکل دیکھ رہا تھا، اُس نے مجھے تھپڑ مارا۔ میں نے جان بوجھ

کر اُس سے لڑائی نہیں کی۔

بیٹا! خدا کسی کو غریب نہ کرے۔ جب غریب ہوئے تو قصور وار ہوئے۔ تمام زندگی

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انہوں نے ہمیں ایک خشک روٹی کا ٹکڑا دیا ہو جو میرے بچے آج اِس کے

کلڑوں پر پلے ہیں۔ خال دارہ نے یہ بات درد بھرے لہجے میں کہی۔

ایک دن استاد نے بھی پڑھائی کے دوران کہا تھا کہ کھیل ایک فالتو کام ہے۔ دوسرے دن جب عبد الولی دکانوں کے پاس گیا تو لڑکوں سے علیحدہ کھڑا ہو گیا۔ لڑکوں کے کھیل کھود کو دیکھ رہا تھا اگرچہ اُس کا دل بہت چاہ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اگر میں خود نہیں کھیل سکتا تو دوسروں کو بھی نہیں کھیلنے دوں گا۔ لڑکے ایک مخصوص کھیل جو کہ بڈئی سے کھیلا جاتا، کھیل رہے تھے۔ جب وہ سب کھیل میں مگن تھے تو عبد الولی نے اچانک یہ تمام (بڈئی) کو ٹوٹ لو کے چنچ سے اٹھا کر بھاگ گیا۔ آس پاس بیٹھے لڑکوں نے بھی بڈئی ٹوٹ لیے۔ جو لڑکے یہ کھیل، کھیل رہے تھے وہ عبد الولی کے پیچھے بھاگنے لگے۔ عبد الولی سوچ رہا تھا کہ اگر لڑکوں کو کھیل سے نہیں روک سکتا تو ان کا کھیل تو خراب کر سکتا ہوں۔

(۴)

ایک ہفتے کی چھٹی گزارنے کے بعد عبد الولی پھر مدرسہ کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ ماں سے رخصت ہو رہا تھا تو ماں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے ساتھ عبد الولی کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ چھوٹی بہن گل پانزائے اُسے انگلی سے پکڑے اُس کے ساتھ کھڑی تھی۔

میں۔۔۔ بھی۔۔۔ تو مالے۔۔۔ تات۔۔۔ داؤنگی۔ گل پانزائے اپنے تو تمی زبان میں

کہا۔

ماں نے گل پانز کو اپنی گود میں لیا۔ طالب لالا واپس آئیگے، پھر تمہیں بھی ساتھ لے جائینگے۔ مگر وہ بھند تھی، عبد الولی نے اُسے پیار کیا، جو ما، گھر سے روانہ ہوا۔

گل پانز کو اسی طرح روتے چھوڑ دیا۔

باہر عبد الولی کے چچا کی گاڑی کھڑی تھی۔ سلیم اور اُس کا بھائی سکول جانے کیلئے اُس میں بیٹھے تھے۔ عبد الولی کا مدرسہ اسی راستے نزدیک پڑتا تھا۔ عبد الولی چچا کے قریب گیا اور اُن سے

کہا۔

چچا! میں بھی آپ کے ساتھ چلا جاتا ہوں، راستے میں اتر جاؤنگا۔

بہت بے شرم لڑکے ہو، پچھلے دن سلیم سے لڑائی کی آج اُس کی گاڑی میں بیٹھنے کیلئے

کہہ رہے ہو۔ چچا نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

وہ بھی نا اُمید ہوا، کپڑوں کی گٹھڑی ہاتھ میں لیے بڑی سڑک کی طرف روانہ ہوا۔

نا اُمید ہو کر سوچ رہا تھا کہ میری بھی عجیب قسمت ہے، ہر کسی کو مجھ سے نفرت ہے، اپنا ہی چچا مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ کوئی بھی مجھے کھیل میں اپنے ساتھ شریک نہیں کرتا، انہی

سوچوں میں تھا کہ گاؤں کا ایک شخص اس کے قریب آیا جو اپنے بچے کو سکول لے جا رہا تھا۔ طالب!

تم پہلوان کے بیٹے ہو؟ شخص نے پوچھا۔

ہاں۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

مدرسہ میں پڑھتے ہو؟ شخص نے پھر پوچھا۔

ہاں مدرسہ میں قرآن شریف حفظ کر رہا ہوں۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

شبابا! بہت اچھا کام کر رہے ہو۔ یہ لودس روپے اپنے لیے چیزیں خرید لیتا۔ شخص نے

عبد الولی کو دس روپے دیتے ہوئے کہا۔

عبد الولی نے شخص سے دس روپے لے کر جیب میں رکھ لیے اور بس کے سٹاپ پر کھڑا

ہو کر بس کا انتظار کرنے لگا۔ اُن کے گاؤں کی اپنی بس نہیں تھی، دوسرے گاؤں کی بس آتی اور وہ

ان بسوں میں جاتے۔ ان بسوں میں عورتیں پچھلی سیٹوں پر بیٹھتی اور مردانگی سیٹوں پر بیٹھتے۔

چھت پر بھیڑ بکریاں کھڑی کی جاتی۔ جب کبھی بھیڑ بکریاں زیادہ ہو جاتیں تو بس کے اندر گلی میں

کھڑی کی جاتیں۔ یہ پیشاب وغیرہ کرتیں تو زیادہ تر لوگوں کے کپڑے خراب کر دیتیں۔ مگر لوگ

مجبور تھے، دوسرا کوئی چارا نہیں تھا۔ زیادہ تر بسوں کے شیشے ٹوٹ چکے ہوتے، مٹی اس طرح اندر

اُڑتی جیسے کوئی خود ہاتھ سے اُڑا رہا ہو۔ لوگ جب گاؤں سے بازار یا بازار سے گاؤں پہنچنے تو اُن کی

شکلیں گرد کی وجہ سے پچھانی نہیں جاتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مٹی کے ڈھیر سے نکلے ہوں۔ بس

جب گاؤں سے شہر کی طرف نکلتی تو ہر جگہ رُکتی، اسی وجہ سے پہنچنے میں بہت دیر لگتی۔ لوگوں کا پورا

دن اسی میں ضائع ہوتا۔ جب بازار سے نکلتا تو یہ بس یورپوں اور سامانوں سے بھر جاتی۔ آٹا، چینی،

گوشت وغیرہ یعنی تمام ضروری سامان سے بھر اہوتا۔ تھیلے اس لیے زیادہ ہوتے کیونکہ گاؤں کے

لوگ مہینے بھر کا سودا ایک ہی دن لاتے۔ یہ لوگ مہینے دو میں ایک دفعہ بازار جاتے وہ بھی کسی

ضروری کام سے، ورنہ بہت ہی کم لوگ بازار جاتے۔ بس جہاں بھی رُکتی یہ سب ایک مرتبہ ضرور

اُترتے۔ کنڈیکٹر جب ان کو دوبارہ بس میں بٹھاتا تو بیچارے کا بُرا حال ہوتا۔

کچھ دیر بعد بس پہنچ گئی، عبد الولی بس میں سوار ہوا، وہ بس کی گلی میں کھڑا ہو گیا۔ منشی

کراہے لینے آ گیا۔ عبد الولی نے ایک مرتبہ جیب میں ہاتھ ڈالا کہ منشی کو کراہے دے لیکن واپس خالی

ہاتھ جیب سے نکالا۔ اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ یہ پیسے منشی کو دے۔

ایسے ویسے کیوں ہو رہے ہو، جلدی کرو کر ایہ دو۔ منشی نے کہا۔
طالب سے کوئی کرایہ نہیں لیتا۔ کیا خبر کہ اس کا پاس ہے بھی یا نہیں۔ دوسرے شخص
نے منشی سے کہا۔

اگر اتنا ہی دکھ ہو رہا ہے تو تم ہی اس کی جگہ پر کرایہ دے دو۔ منشی نے کہا۔
کیوں نہیں دوں گا تمہاری قسمت میں ثواب نہیں لکھا، بتاؤ کتنا کرایہ ہے۔ شخص نے منشی
کو کرایہ دیتے ہوئے کہا۔

چار روپے ہوتے ہیں دو روپے دو تاکہ ہم بھی ثواب کمائیں۔ منشی نے کہا۔
عبدالولی سمجھ نہیں رہا تھا کہ یہ ثواب صرف مجھ سے کیوں بڑا ہے۔ جب کبھی وہ
مدرسہ کیلئے گاؤں میں وظیفہ اکٹھا کرتا تو اس وقت بھی کبھی کبھار لوگ اُسے روپیہ دو روپیہ ثواب
کی نیت سے دیتے۔ یا پھر اپنے بچوں کے پڑانے کپڑے ثواب کی نیت سے دیتے۔ پھر جب کبھی
مدرسہ میں زکوٰۃ یا خیرات کی نیت سے لوگ کچھ دیتے تو ان میں وہ لوگ زیادہ تر حصہ لیتے جن کے
بچے مدرسہ میں نہیں سکول میں پڑھتے تھے۔ جب کبھی گاؤں میں کوئی خیرات ہوتی تو سب سے
پہلے حصہ مدرسہ بھیجا جاتا۔ گرچہ ان تمام باتوں کا اس کے پاس کوئی حل طلب جواب نہ تھا مگر
ثواب کے تصور نے اس کے دماغ پر یہ اثر کیا تھا کہ تمام خیرات و زکوٰۃ ان کا حق ہے۔ صرف اس
نے نہیں بلکہ مدرسہ میں ہر طالب یہی سوچ رکھتا جب کبھی خیرات کا سنتے تو بغیر پوچھے پہنچ جاتے۔
استاد بھی انہیں نہیں روکتے۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بھی لوگوں کے ثواب کو مد نظر رکھا ہو۔ اور
خیرات ہوتی بھی انہی پر۔ مدرسہ میں سوکھی روٹی لسی کے ساتھ کھاتے۔ کبھی کبھار دال یا آلو
ہوتا۔ گوشت تو وہ صرف مہینے میں ایک بار ان کی عیاشی ہوتی۔ دودھ پتی چائے یا پھر بیٹھا تہوہ تو
مدرسہ میں ان کا خواب تھا۔ اسی لیے یہ چیزیں خیرات میں لینا ان کا حق تھا۔

طالب جاؤ ان عورتوں کے ساتھ سیٹ خالی ہے اس میں بیٹھ جاؤ۔ اُس شخص نے کہا جس
نے عبدالولی کا کرایہ دیا تھا۔

عبدالولی بھی جا کر عورتوں کے ساتھ سیٹ میں بیٹھ گیا۔ جس عورت کے ساتھ وہ بیٹھا تھا اُس کے پاس ایک ٹوکری تھی۔ اس ٹوکری میں ایک مرغی تھی، ساتھ میں ایک عورت برقعہ پہنے بیٹھی تھیں جو وقفے وقفے سے کھڑکی سے سر باہر نکالتی۔ اس کو اُلٹی آرہی تھی۔ اُلٹی کی وجہ سے گلہ خشک ہو گیا تھا۔ جب وہ اُلٹی کرتی ساتھ بیٹھی عورت اپنا منہ بند کر لیتی۔ جس نے مرغی ساتھ لی تھی۔ اُسے بھی اُلٹیاں آنی شروع ہو گئی۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا ہوا تھا۔ اگلی دفعہ جب عورت نے اُلٹی کی تو یہ مرغی والی عورت بھی اور نہ سنبھال سکی۔ اُس نے بھی بھرے منہ اُلٹی کی۔ ساتھ بیٹھے عبدالولی اور قریب قریب لوگوں کے کپڑے خراب کر دیے۔ ایک سواری نے کنڈیکٹر کو آواز دی۔

یہ تم لوگوں نے کیا ڈرامہ شروع کیا ہے۔ جب دیکھو ہر کسی کو بٹھاتے ہو۔ کس لیے بٹھاتے ہو اگر اُلٹی آرہی ہے۔ ہمارے کپڑے خراب کرادیے۔

کیا کریں حاجی صاحب! جب ہم انہیں نہیں بٹھائیں گے تو یہ بیچاری کس چیز میں جائیں گی۔ کنڈیکٹر نے کہا۔

انہیں شہر میں کیا کام ہے؟ گھر بیٹھیں۔ شخص نے کہا۔
کیوں؟ صرف تمہاری ضرورت ہے ان کی نہیں؟ دوسرے شخص نے کہا۔
اگر ضرورت ہے تو منہ سی کر بیٹھ جائیں۔ ہمارے کپڑے تو خراب نہ کریں۔ پہلے شخص نے کہا۔

اس پچھلی سیٹ پر اگر میں تمہیں بٹھاؤں تو تم بھی اُلٹیاں کرو گے۔ بس کی پچھلی سیٹیں اتنی اچھلتی ہیں۔ یہ تو ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو سنبھالا ہے۔ دوسرے شخص نے کہا۔
جس دوسری عورت نے اُلٹی کی تو ان کے ہاتھوں سے ٹوکری گر گئی تو ٹوکری سے مرغی باہر نکلی اور بس میں دوڑنے لگی۔ کسی کے سر پر بیٹھ جاتی تو کسی کے کاندھے پر۔ بس میں افراتفری

ہوگئی۔ کنڈیکٹر نے بس کو روکا، مرغی کو پکڑا، واپس ٹوکری میں ڈالا۔ الٹی پر مٹی ڈالی۔ ایک شخص نے عورت کو مخاطب کر کے کہا۔

اس مرغی کا کیا کردگی جو لے جا رہی ہو۔

بیٹی کے ہاں لے جا رہی ہوں۔ کل اُس کا بچہ پیدا ہوا ہے۔ اُس کیلئے ذبح کرو گئی۔

عورت نے کہا۔

ہو، ہو۔ ایک تو یہ بیٹیاں نہ تو اُن کا پیٹ بھرے گا، نہ تم لوگوں کے ارمان پورے

ہونگے۔ شخص نے افسوس کے انداز میں سر ہلایا۔

کنڈیکٹر نے پھر آواز دی۔ چلو استاد۔ بس روانہ ہوئی۔

عبدالولی اپنے مدرسہ پہنچ گیا، وہ اپنے درس میں مشغول ہو گیا۔ کچھ مہینوں کے بعد مدرسہ کے مہتمم اور اساتذہ نے اُن سے امتحان لیا۔ امتحان کے اختتام پر مہتمم نے تمام طالبان کو اکٹھا کر کے کہا۔

عزیز طالبان! جب کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ اب ہمارے مدرسہ کے درس کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے۔ اب مہینے دو چھٹی ہوگی۔ چھٹیوں کے بعد مدرسہ دوبارہ کھل جائے گا۔ جیسا کہ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ مدرسہ اپنا ذریعہ آمدن نہیں رکھتا۔ مدرسہ میں کم و بیش سو کے قریب طالبان پڑھتے ہیں۔ اِن سب کا خرچہ بذریعہ چندہ پورا کیا جاتا ہے۔ میں آپ لوگوں کے سامنے ہوں۔ میرے پاس کچھ نہیں۔ یہ خدمت میں نے اپنے کندھوں پر رکھی تو نہ میری زمین ہے نہ ہی کوئی دوسرا کاروبار۔ تمام زندگی دین کی خدمت کیلئے وقف کی ہے۔ اور یہ کام اللہ کی رضا کیلئے اور روزِ آخرت میں ثواب کی نیت سے کر رہا ہوں۔

آپ لوگوں سے گزارش ہے کہ اس خدمت میں میرے ساتھ تعاون کیجئے۔ میں نے چندے کی کاپیاں چھپوادی دی ہیں، وہ میں آپ لوگوں کے حوالے کر دوں گا۔ چندے کیلئے وہ طالبان جائیں گے جو پچھلی مرتبہ گھر گئے تھے، اور وہ طالبان جو نئے ہیں اور پچھلے پانچ چھ مہینوں کے دوران

آہیں ہیں۔ پچھلی مرتبہ جو طالبان چندے کیلئے گئے تھے وہ اس مرتبہ گھروں کو جائیں گے۔ اور رمضان مبارک کے فوراً بعد واپس مدرسہ آئیں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ لوگ اس کام میں پوری ایمانداری کے ساتھ میری مدد کرو گے۔

مہتمم کی باتوں کے بعد جو طالبان چندے کیلئے جانے والے تھے رہ گئے، اور باقی طالبان اپنے گھروں کو چل دیے۔ عبدالولی اور اُس کے ایک اور دوست کو چندے کی کاپیاں دے دیں گئی۔ عبدالولی کا ساتھی اللہ داد تھا جو عبدالولی سے سات یا آٹھ سال بڑا تھا۔ دونوں طالبان مدرسے کے چندے کیلئے روانہ ہو گئے۔ آج ایک گاؤں کل دوسرا گاؤں، اس مسجد میں رات گزاری تو کبھی اُس مسجد میں رات گزاری۔ نماز کے بعد چادر بچھا کر چندہ کا پی اُس پر کھلول کی طرح سامنے رکھتے۔ کبھی کوئی کچھ پیسے دے دیتا تو کبھی صرف تہرزدہ آنکھوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ ایک دن عبدالولی اپنے ساتھی کے ساتھ بیٹھا تھا کہ ایک شخص نے انہیں متوجہ کیا۔

طالبان! السلام علیکم۔

وعلیکم السلام۔ دونوں نے بہ یک وقت جواب دیا۔

کس مدرسہ سے آئے ہو؟ شخص نے پوچھا۔

آج کل تو مدرسے بھی اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ قدم قدم پر مدرسہ موجود ہے۔ ایک

دوسرے شخص نے طالبان کی جگہ جواب دیا۔

اللہ ان کی تعداد اور بڑھائے۔ یہ تو دین کی خدمت ہے۔ پہلے شخص نے کہا۔

یہ کوئی خدمت ہے۔ سب بچوں سے بھیک منگوار ہے ہیں، جس مسجد میں جاؤ انہوں نے چادر بچھائی اور اوپر چندہ کا پی رکھی بیٹھے ہو گئے۔ اتنا سبق نہیں پڑھاتے جتنا ان سے چندہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ دوسرے شخص نے بات پوری کی۔

پہلا شخص اِس کے بجائے کہ دوسرے شخص کو جواب دیتا وہ طالبان سے مخاطب ہوا۔

چلو میرے ساتھ آج رات میرے ساتھ کھانا کھاؤ۔

عبدالولی اور اُس کے ساتھی نے چادر سمیٹی اور شخص کے ساتھ روانہ ہوئے۔ شخص انہیں اپنے مہمان خانے میں لے آیا اور اُن کو وہیں بٹھایا۔

تم دونوں یہیں بیٹھو، میرا بیٹا تم لوگوں کیلئے کھانا لے آئے گا۔ کھانا کھانے کے بعد یہیں سو جانا، صبح نماز کیلئے پھر مسجد چلے جانا۔ شخص یہ بات کہہ کر گھر چلا گیا۔

کتنا اچھا آدمی ہے۔ عبدالولی نے اپنے دوست سے کہا۔

ہاں بھائی! دنیا میں آج بھی اچھے لوگ موجود ہیں۔ دوست نے کہا۔

کتنے خوش نصیب ہیں، گھر میں سب کچھ موجود ہے، دیکھتے ہیں کھانا کتنا اچھا ہوگا؟۔

عبدالولی نے لاشعوری طور پر اپنی محرومی کا اظہار کیا۔

یہ سب قسمت کی باتیں ہیں۔ دوست نے کہا۔

اسی اثنا ایک خوبصورت لڑکا ہاتھ میں چلچلی اور پانی کا لوٹا لیے آیا۔ جسے ایک طرف رکھ کر، دونوں سے مصافحہ کیا، پھر دونوں کے ہاتھ دھلوائے۔ دوسرا چھوٹا بچہ دسترخوان اٹھائے آیا، اس لڑکے نے دونوں کے ساتھ کھانا کھایا، کھانا کھانے کے بعد لڑکے نے دونوں کے سونے کا بندوبست کیا۔ اور خود گھر چلا گیا۔

میں نے کہا تھا نا! کھانا دیکھا، کتنا زیادہ گوشت تھا، چاول کتنے مزیدار تھے۔ عبدالولی نے

اپنے دوست سے کہا۔

قسم سے سچ کہا تم نے، ہمارے پیٹ میں تو اب دال اور آلو کی فصل اُگ چکی ہے۔

دوست نے کہا۔

وہ تو صرف نام کے دال اور آلو ہیں، ایسا لگتا ہے جیسے دریا کے پانی میں نوالہ ترکیب جاتا

ہے۔ عبدالولی نے کہا۔

تم فکر مت کرو، اللہ ہمیں بھی پیسے دے دیگا، پھر ہم بھی اسی طرح گوشت کھایا کریں

گے۔ دوست نے کہا۔

یہ کتنا اچھا لڑکا تھا، ہمارے ساتھ کتنے اچھے انداز میں پیش آیا، اور ایک میرا چچا زاد بھائی ہے جو اپنے سکول اور باپ کی پیسوں پر مغرور ہے۔ کسی کا لحاظ بھی نہیں کرتا۔ عبد الولیٰ نے کہا۔
سوجاؤ، صبح جلدی اٹھنا ہے۔ دوست نے کہا۔
دونوں اپنے اپنے بستر پر سو گئے۔

صبح سویرے گھر والوں نے انہیں جگایا، اُن کے ساتھ یہ دونوں بھی مسجد چلے آئے، نماز پڑھی، پھر نماز کے بعد مسجد کے طالبان کے ساتھ تہوہ چائے اور سوکھی روٹی کا ناشتہ کیا۔ چاشت کے وقت دوسرے گاؤں کی طرف روانہ ہوئے، جب دوسرے گاؤں پہنچ گئے تو چندے کے پیسوں سے ایک صابن خریدا۔ گاؤں کے مسجد میں گئے، کپڑے اُتارے، اپنی چادروں سے دھوئی (لنگ) باندھے۔ کپڑے دھوئے اور تار پر سوکھانے کیلئے ڈال دیے۔ دو لڑکے جن کے گھر مسجد کے قریب تھے مسجد کے سامنے بٹے (گولیاں) کھیل رہے تھے۔ جیسے ہی اُن کا دھیان طالبان کے کپڑوں کی طرف ہوا تو دونوں نے ایک دوسرے کے کان میں کچھ کہا اور پھر اُٹھ کر وہاں آگئے جہاں ان دونوں کے کپڑے سوکھنے کیلئے تار پر لنگ رہے تھے۔

عبد الولیٰ کی قمیص اور اللہ داد کی شلوار پُڑا کر بھاگ گئے۔ یہ دونوں اُن کے پیچھے بھاگنے لگے، وہ دونوں گھر میں گھس گئے، یہ دونوں دروازے کے سامنے کھڑے ہو گئے، کہ اتنے میں ایک شخص باہر نکلا۔

کون ہو جو گلی میں ننگے کھڑے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ شرم نہیں آتی؟ شخص نے غصے میں کہا۔

ہم نے مسجد میں کپڑے دھو کر تار پر لٹکائے تھے کہ دو لڑکے انہیں پُڑا کر اس گھر میں گھس گئے۔ اللہ داد نے کہا۔

دفع ہو جاؤ بے غیرتوں۔ پر ائے لڑکے ہو اور ننگے گلیوں میں گھوم رہے ہو۔ بے حیائی کر رہے ہو یہاں۔ شخص نے پھر وہی انداز اپنایا۔

چاچا! ہمارے پاس اور کپڑے نہیں ہیں۔ وہی ایک جوڑا ہے۔ ہم کہاں جائیں؟ عبد الولی نے اپنی مجبوری بیان کی۔

چاچا! شخص نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ میں تمہیں چاچا نظر آرہا ہوں۔ تم دونوں ہو کون؟ کہاں کے ہو؟ اور اس گاؤں میں کیا کر رہے ہو؟

ہم مدرسہ میں پڑھنے والے طالب ہیں، اور چندہ جمع کرنے کیلئے آئے ہیں۔ اللہ داد نے کہا۔

چندہ کیلئے آئیں ہیں۔ شخص نے اللہ داد سے اسی انداز میں کہا۔ کیوں یہ نہیں کہتے کہ چور ہو۔ چندے کے نام پر گاؤں میں چوریاں کرتے ہو۔ لوگوں کے گھروں میں گھستے ہو۔ جاؤ یہاں سے، دوبارہ یہاں تمہیں نہ دیکھوں۔ اسی اثنا ایک بچہ ان کے کپڑے لے آیا،

میری ماں کہتی ہے یہ کپڑے تم لوگوں کے ہیں؟ بچہ ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ہاں ہمارے ہیں۔ عبد الولی نے جھپٹ کر بچے سے کپڑے لے لیے۔

یہ دونوں جب بھی کسی گاؤں جاتے تو کھیل کھود میں لگ جاتے۔ یا پھر کھیل کا تماشہ کرتے۔ گاؤں کے لڑکے بھی انہیں تنگ کرتے۔ کبھی کوئی ان سے ان کی پگڑی چھین لیتا، دوسرا ان کے سر پر مٹی ڈال دیتا۔ تو یہ دونوں منت سماجت کرتے یا پھر کبھی کبھار نوبت جنجال تک پہنچ جاتی۔ کسی بھی گاؤں میں جاتے اُس گاؤں کے لڑکوں کو یوں لگتا جیسے دوسرے علاقے کے کُتے علاقائی کُتوں کے ہتھے چنھ گئے ہیں۔

(۵)

مدرسہ کھلنے سے پہلے دونوں مدرسہ پہنچ گئے۔ مہتمم گرچہ خوش نہیں تھا مگر دونوں نے اتنا چندہ اکٹھا کیا تھا کہ ناراض بھی نہیں تھا۔
عبدالولی سے کہا کہ تم ایک مرتبہ گھر جاؤ، پڑھائی کیلئے کچھ دن ہیں، پھر واپس آجانا۔
عبدالولی بہت خوش ہوا۔

جب گھر پہنچا تو ماں پہلے سے زیادہ بیمار تھی۔ گل پانڑا اب اچھی طرح بول سکتی تھی۔
بھائی سارا دن گریبان چاق جو توں کے بغیر گلیوں میں کھیل کود میں مصروف تھے۔ احمد خان جو کہ
عبدالولی سے گیارہ مہینے چھوٹا تھا کبھی کبھی اپنے والد کے ساتھ مزدوری پر جاتا۔ عبدالولی ماں کی
بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ سارا دن ماں کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ گھر کا کام کاج بھی کرتا،
کپڑے بہت اچھی طرح دھوتا تھا۔ کیونکہ وہ مدرسہ میں اپنے کپڑے خود دھوتا تھا۔ جب کبھی
چچیرہ بھائی سلیم اسے دیکھتا تو بغیر مذاق کے اُسے کوئی اور کام نہ تھا۔ لڑکوں کے سامنے اُس کا مذاق
اڑاتا، گلی محلے کے دوسرے لڑکے بھی اُس نے ساتھ ملا لیے تھے۔ عبدالولی اُسے اس لیے کچھ نہیں
کہتا کہ پھر اُس کے والدین ہمارے ساتھ جھگڑیں گے۔

ایک دن عبدالولی عصر کی نماز کے بعد گھر آیا، ابا بھی اُسی وقت مزدوری سے آئے
تھے، بہن اُس کیلئے تہوہ چائے لے آئی، وہ ماں کے ساتھ بیٹھ گیا، اچانک ماں کی سانسیں اکھڑنے
لگیں، آنکھیں ایک ہی جگہ پر ٹھہر گئیں،

بابا۔۔۔ بابا۔۔۔ ماں کو کیا ہوا۔ عبدالولی نے جلدی سے والد کو مخاطب کیا۔

والد نے بھی جلدی سے چائے کا پیالہ رکھا اور بھاگ آیا۔

کیا ہوا؟

پتہ نہیں، میں جب آیا تو بالکل ٹھیک تھیں۔ اب کیا ہو گیا۔ عبدالولی نے روتے ہوئے

جواب دیا۔

وہاں لعل محمد کے پاس جاؤ، اور اُس سے کہو کہ آئے اور اسے اپنی گاڑی میں ڈاکٹر تک لے جائے۔ والد نے کہا۔

عبدالولی بھاگتا ہوا اپنے گھر سے چچا کے گھر گیا۔ گیٹ کے ساتھ ہی سلیم اپنے بھائی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ جیسے ہی عبدالولی کو دیکھا تو اُس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

کیا کر رہے ہو جو بھاگتے ہوئے آرہے ہو، ایسا لگ رہا ہے جیسے کُتا پیچھے پڑا ہو۔ میری ماں کو پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔ اچھے چاچو کدھر ہیں؟ عبدالولی کی سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔

کیوں اچھے چاچو ڈاکٹر ہیں۔ سلیم اُس پر ہنسا۔

بابا کہہ رہے تھے کہ گاڑی میں ڈاکٹر تک لے جائیں گے۔ عبدالولی نے کہا۔

جاؤ جاؤ، وہ تمہاری ماں کا نوکر نہیں۔ سلیم نے عبدالولی کو دھکادے کر کہا۔

خدا کیلئے، میری ماں مر جائے گی۔ ایسا مت کرو۔ عبدالولی نے منت سماجت کی۔

تو کیا ہو اجو مر گئی۔ اچھا ہے کہ مر جائے۔ سلیم نے اُسے پھر دھکا دیا۔

اسی اٹنا پہلوان بھی پہنچ گیا۔

تم ابھی تک یہی کھڑے ہو؟

یہ مجھے جانے نہیں دے رہا۔ عبدالولی نے والد سے کہا۔

پہلوان نے عبدالولی کی بات نہیں سنی اور بھائی کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں

بھائی اور بھابھی بیٹھے چائے پی رہے تھے، عبدالولی بھی کوشش کر رہا تھا کہ والد کے پیچھے جائے، مگر

سلیم نے اُس کی پگڑی گرا دی۔ وہ بغیر پگڑی کے والد کے پیچھے چلا گیا۔ جب وہاں والد اور چچا کی

باتیں سنیں تو واپس اپنی پگڑی کیلئے آگیا۔ جاتے جاتے سلیم کی گردن پر ایک مکہ دے مارا اور گھر کی

طرف روانہ ہوا۔ جب گھر پہنچا تو والدہ کچھ ہوش میں آچکی تھیں، عبدالولی خوش ہوا۔ اُس نے ماں

سے ابھی کچھ پوچھا بھی نہیں تھا کہ صحن میں والد اور چچا کی آواز سنائی دی۔

میں تمہارے سامنے اُسے پھانسی دے دوں گا۔ تم اتنا غصہ مت کرو۔ پہلوان اپنے چھوٹے بھائی لعل محمد سے کہہ رہا تھا۔

نہیں لالا! نہ آپ کو شرم آتی ہے اور نہ ہی آپ کے لڑکے کو۔ یہ کون ہوتا ہے جو میرے بیٹے کو پیٹے۔ ایک دن نہیں دو نہیں، آیا نہیں ہوتا کہ میرے بیٹے کو پیٹنے لگتا ہے۔ پچھلی بار بھی میں نے اُس سے کہا تھا کہ میرے بچوں سے دُور رہو، مگر اُسے کوئی شرم نہیں۔ آج فیصلہ ہو کر رہے گا، اب یا میں اس گاؤں میں رہوں گا یا آپ کا بیٹا۔ لعل محمد اتنے غصے میں تھا جیسے اُس کے بیٹے کو کسی نے قتل کیا ہو۔

کہاں ہے یہ دلی کا بچہ؟ پہلوان کرے کی طرف گیا۔

ماں جس کی ابھی ابھی تھوڑی طبیعت ٹھیک ہوئی تھی پوچھنے لگی کہ کیا ہوا؟ پھر کیا طوفان آیا ہے۔

پہلوان بغیر پوچھے عبد الولی کو پیٹنے لگا، کبھی لات تو کبھی گھونہ۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔ میں نے تمہیں کس لیے بھیجا تھا اور تم کیا کر آئے ہو۔

میں نے کچھ نہیں کیا۔۔۔۔۔ اس۔۔۔۔۔ اس۔۔۔۔۔ کا۔۔۔۔۔

زبان چلاتے ہو، چُپ ہو جاؤ۔ والد نے گردن پر ایک تھپڑ مارا۔

بھائی لعل محمد! صبح یہ چلا جائے گا، میں کہہ رہا ہوں آپ جاؤ۔ پہلوان نے اسی غصے میں

اپنے بھائی سے کہا۔

میں دیکھتا ہوں یہ کیسے نہیں جانتا۔ اگر یہ نہیں گیا تو مجھے دوسرا طریقہ آتا ہے۔ لعل محمد

نے بھائی کو دھمکی دی اور چلا گیا۔

جب بھی آتے ہو کوئی نہ کوئی پریشانی ساتھ لاتے ہو۔ میرے گھر سے نکل جاؤ، میں

تمہاری خاطر اپنے بھائی سے نہیں لڑ سکتا۔ تمہیں جانا ہو گا۔ جانا ہو گا۔ پہلوان نے عبد الولی کو دھکا

دیا۔

تھیں ہو کیا گیا ہے جو بچے کو دھکے دے درہے ہو۔ تمہارے بھائی کو میرے بچے کبھی بھی پسند نہیں تھے۔ خال دارہ نے اپنے خاوند سے کہا۔

ہاں، ہاں۔ تم بھی اس کی طرف دار بن جاؤ۔ تاکہ یہ ٹھیک ہو جائے۔ پہلو ان نے اپنی بیوی سے کہا۔

عبدالولی نے بھی اپنے کپڑے اکٹھے کیے اور ماں کے قریب ہوا۔
ماں میں جا رہا ہوں۔ عبدالولی نے مایوسی اور رونے کے انداز میں کہا۔
کہاں جاؤ گے اس وقت؟ ماں نے پوچھا۔
مدرسے جاؤنگا۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

اس وقت تم مدرسے جاسکتے ہو؟ یہ وقت جانے کا نہیں۔ صبح چلے جانا۔ ماں نے کہا۔
صبح سویرے عبدالولی اپنی گھڑی اٹھائی۔ ماں کا ہاتھ چومنا۔ گل پانزا کو آنسوؤں سمیت پیار کیا۔ اور روانہ ہو گیا۔ بڑی ناامیدی کے ساتھ دروازے سے باہر گیا۔ جب گاؤں کے ٹیلے پر پہنچا تو آنکھوں میں آنسو لیے ایک نظر گاؤں کی طرف دیکھا۔ اُس نے اپنے آپ سے فیصلہ کر لیا تھا کہ جب تک میں بڑا آدمی نہیں بن جاتا گاؤں نہیں آؤنگا۔ اچھی طرح سبق پڑھونگا، عالم بنوں گا، پھر آؤنگا۔ پھر اپنی گھڑی کو دیکھا جس میں وہ اپنے پڑانے کپڑوں کے ساتھ ساتھ اس گاؤں کی نفرت بھی ساتھ لیے جا رہا تھا۔

(۶)

وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ اپنی گردش برقرار رکھتا ہے۔ اسی طرح وقت نے عبدالولی کی زندگی کا رخ بھی بدل دیا۔ عبدالولی زندگی کے اُس موڑ پر تھا جس میں کانٹے بھی پھول لگنے لگتے ہیں۔ مگر وہ صرف پھولوں ہی کی خواہش کر سکتا تھا۔ اُس کی زندگی تو پھولوں سے کانٹوں میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اِس مدرسہ میں نصف قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد وہ دوسرے مدرسے چلا گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گھر والوں کو پتہ چلے کہ وہ کس مدرسے میں ہے۔ اُس نے بہت سے مدارس کے چکر کاٹے اور ساتھ ہی ساتھ ہر مدرسے کے چندے کیلئے بہت سی جگہوں پر چادر بھی بچھائی۔ اب اُس نے قرآن شریف حفظ کر لیا تھا۔ عبدالولی کے سینے میں قرآن شریف کے ساتھ ساتھ تین چہرے ایسے بھی تھے جو کہ پیار و محبت کا چادر اوڑھے محفوظ تھے۔ اور باقی تمام چہرے نفرت زدہ تھے۔ ماں، بہن اور زر قا کو اُس نے اپنے حافطے میں مقام محبت کا درجہ دیا تھا۔ عبدالولی نے بچپن ہی سے زر قا کو اپنے تصور میں ایک محبوبہ کا مقام دیا تھا۔ زر قا کی ایک خیالی تصویر اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی۔ اور جب بھی اپنے بستر میں سونے لگتا تو زر قا کی خیالی تصویر اُس کے خیال کا کینوس پر اُس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا۔ کبھی وہ اُس کے پاس ہوتی۔ کبھی وہ اُس کی باہوں میں باہیں ڈالے ہوتا تو کبھی اُسے سینے سے لگا لیتا۔ زر قا کی بچپن کی محبت اُس کی جوانی کے ایام میں اُس کے وقت گزارنے کا ایک ذریعہ بن گئی تھی۔ جو پیار زر قا نے عبدالولی کو بچپن میں دیا تھا پھر دنیا میں اُس کیلئے پیار کا حصہ تمام ہوا تھا۔ پھر نہ کوئی اُس کیلئے چھپ کر چیزیں لایا اور نہ پھر اُس نے اپنے لیے پیار بھری آواز سُنی۔ اُس کے کان پیار کے الفاظ سے نا آشنا ہوئے تھے۔ اِس گزری ہوئی زندگی میں یا تو اُس نے ہمدردی کے الفاظ سنے تھے یا پھر نفرت کے۔ اُس کے شعور کے پردے پر صرف نفرت کے عکس نظر آرہے تھے۔ ماں، بہن اور زر قا کے عکس بھی نفرت زدہ نظر آنے لگتے۔

نفرت اس طرح اُس کے گرد لپٹی تھی جیسے تصویر پر فریم۔ بچپن سے وہ اس نفرت کے ساتھ لڑ رہا تھا۔ اس لڑائی نے عبد الوالی میں ایک اور عبد الوالی کو جنم دیا تھا۔ ایسا عبد الوالی جو پیار بھی نفرت ہی کے ذریعے کرتا تھا۔

عبد الوالی ایک خوبصورت نوجوان بن چکا تھا۔ بڑی آنکھیں، باریک مونچھیں اور ناک بھی تھوڑی موٹی ہو گئی تھی۔ گھنی بھنویں، لمبا قد، روئی کی طرح داڑھی۔ عبد الوالی بچپن ہی سے سُرخِ مالک تھا۔ آنکھیں اُس کی ہر وقت میلی رہتیں۔ سر کے بال منڈھے ہوئے۔ مہینے میں ایک بار ضرور وہ سر منڈھواتا۔ پاؤں لمبے ہونے کے بجائے چوڑے تھے۔ اس لیے کہ بغیر جوتوں کے زیادہ پھرتا تھا۔ ہاتھ اور پاؤں اکثر سردیوں میں خشکی کی وجہ سے پھٹے ہوتے۔ قد و قامت میں بالکل اپنے باپ پر گیا تھا۔

مگر اب، جوانی میں ایک مضبوط قد و قامت کا مالک بن گیا تھا۔ منڈھے (گنچے) سر کی بجائے اب اُس نے بڑے بال رکھے تھے۔ آنکھوں میں اب میل کی بجائے سُرماتھا۔ اب عبد الوالی خواہوں کا شہزادہ بن گیا تھا۔ مدرسے کی خشک روئی اور لسی نے عبد الوالی کا جسم لوہے کی طرح مضبوط بنا دیا تھا۔ مگر یہ شہزادہ غربت اور طعنوں کی وجہ سے اندر ہی اندر ٹوٹ چکا تھا۔ جس دن سے وہ گاؤں سے اپنے ساتھ نفرت کی گھڑی لایا تھا یہی نفرت کی گھڑی وہ اپنی پیٹھ پر لیے پھر رہا تھا۔ اُس نے پھر گاؤں کی زمین پر پاؤں نہیں رکھا۔ اُس کی کوشش یہی تھی کہ جتنا ہو سکے گاؤں سے دُور رہے۔ اسی لیے تو اُس نے بہت سے مدارس کے چکر کاٹے۔

قرآن شریف کو حفظ کرنے کے بعد عبد الوالی نے دینی کتابوں کا درس شروع کیا تھا۔ اپنے دوست اللہ داد کو اُن تمام باتوں سے آگاہ کیا تھا جو اُس نے برسوں سے اپنے دل میں چھپائے رکھی تھیں۔

اللہ داد، اگرچہ اُس سے عمر میں بڑا تھا مگر ہم عمر دکھائی دیتا تھا۔ حالات کے تھپیڑوں نے اُس کے چہرے کی رونق چھین لی تھی۔ کبھی کبھار شاعری بھی کر لیتا۔ بہت ہی اچھا انسان تھا۔

عبدالولی کو اللہ داد پسند تھا، اسی لیے تو اُس نے اللہ داد کے ساتھ دوستی کا رشتہ مضبوط کیا تھا۔ جس مدرسے میں جاتے تو اکٹھے جاتے۔ اللہ داد قندہار کے کنگھی نغود کارہنے والا تھا جو کہ میوند کا قریبی علاقہ ہے۔ عمر کے فرق کے باوجود عبدالولی اور اللہ داد ایک ہی کتاب (ہدایہ) پڑھتے تھے۔ اللہ داد کو اپنے خاندان سے افغانستان کی جنگ کی وجہ سے ہاتھ دھونا پڑے۔ جبکہ عبدالولی کو نفرت کی وجہ سے اپنے خاندان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ خاندان مٹی میں مل گیا اور عبدالولی کی نفرت زندہ تھی۔

اللہ داد کارنگ گندی، جسامت میں ڈبلا پتلا، جیسے کسی لکڑی کو کپڑے پہنائے جائیں اور داڑھی ٹوڑھی پر زیادہ باقی چہرے پر کم تھی۔ ہلکی مونچھیں جو کہ داڑھی کے ساتھ مل رہی تھیں۔ ہر وقت اُس کے کندھے پر ایک چادر رکھی ہوتی۔ سامنے کے دو دانت تھوڑے بڑے تھے۔ کان بھی سر پر تھوڑے بڑے لگتے تھے۔ اگر چہرہ تھوڑا بھرا ہوتا تو شاید کہ کان بڑے نہ لگتے۔

ان دنوں افغانستان میں تحریک طالبان نے سر اٹھایا تھا۔ افغانستان کے عوام مجاہدین کے داخلی جھگڑوں سے تنگ آچکے تھے۔ مجاہدین کمانڈروں نے اپنے اپنے علاقے تقسیم کیے تھے۔ ایک مرکزی حکومت نہیں تھی۔ افغانستان میں مدد کرنے والے ممالک خاص طور پر مغربی ممالک اور امریکہ اپنے مفادات حاصل کرنے کے بعد افغان عوام اور افغانستان کو اسی طرح بے یارو مددگار اور مجاہدین کو آپس میں لڑتا چھوڑ گئے تھے۔

جس کی جتنی طاقت ہوتی اتنے ہی علاقے پر اپنا کنٹرول رکھتا۔ قدم قدم پر ہر کسی کی اپنی حکومت تھی۔ افغانستان کی عوام ایسے حالات میں گر چکے تھے کہ نہ تو ان کا گھر محفوظ تھا اور نہ ہی عزت۔ نسل نو کو اندھیروں کا سامنا تھا۔ ایسے حالات میں تحریک طالبان قندہار کے سپین بولدک سے علامہ کی امارت میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ عرصہ اسی علاقے تک محدود رہے، پھر آگے بڑھنے لگے جیسے فرشتے ان کے ساتھ ہم رکاب ہوں۔ نام نہاد کمانڈروں کی حکومتوں کو گراتے اور

علاقوں میں امن و امان لاتے۔ چور اُچکے سب ختم ہو گئے۔ ان کا قانون بہت ہی سخت تھا جس پر عمل درآمد کرنا اور کرانے پر ان کی پوری کوشش رہتی۔

تحریک طالبان کے نفاذے چمن، پشین، ژوب، لورالائی حتیٰ کہ پورے پشتون وطن میں بج رہے تھے۔ تمام مدارس کے اساتذہ اور طالبان پورے جوش و جذبے سے تحریک طالبان کی حمایت کرنے کیلئے کمر کئے گئے۔ مولوی صاحبان نے افرادی قوت بڑھانے کیلئے مدارس اور مسجدوں کو استعمال کیا۔

عبدالولی جس مدرسہ میں پڑھتا تھا وہاں بھی تحریک طالبان کے اثرات پہنچ چکے تھے۔ درس و تدریس کی بجائے مدرسہ میں تحریک کو آگے بڑھانے کیلئے عملی کام شروع ہو چکا تھا۔ مدرسہ میں ایسے طالبان بھی دیکھے جاتے جنہیں پشتون زبان بولنی نہیں آتی تھی۔ اور درس و تدریس سے بھی اُن کی خاص دلچسپی نہ تھی۔ زیادہ تر وقت وہ مدرسہ کے مہتمم کے کمرے میں مہتمم کے ساتھ گزارتے۔ اکثر صبح جاتے اور شام کو آتے۔ طالبان کے اس تحریک نے عوام میں ایک اُمید کی کرن پیدا کی تھی۔ اسلامی نظام زندگی کی اُمید، انصاف اور بھائی چارے کی اُمید، اس لیے عوام کی جانب سے اس تحریک کو خوش آمدید کہا گیا۔ عبدالولی کے دل میں بھی اُمید کی کرن دکھائی دینے لگی۔ نا اُمید دل پر کاروان اُمید دستک دینے لگا۔ مہتمم مدرسہ کی جو شیلے تقاریر نے درس کی بجائے عملی میدان میں کودنے کے ارادے مضبوط کیے۔

اللہ داد اخوند! کیا کہتے ہو طالبان کے ساتھ جہاد پر جائیں؟

عبدالولی اخوند! مجھے تو اس نام سے بھی نفرت ہونے لگی ہے۔ اس نام پر ہماری عوام نے اتنے دھوکے کھائیں ہیں کہ حساب نہیں۔ اللہ داد نے کہا۔

پُرانی باتوں کو چھوڑو، اب تو طالبان یہ کام کر رہے ہیں۔ میرے اور تمہارے جیسے طالبان۔ عبدالولی نے کہا۔

جہاد بھی میری اور تمہاری طرح کے لوگ کر رہے تھے جو بعد میں فساد میں تبدیل ہو۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

اب ایسا نہیں ہو گا، میرا یقین ہے کامیابی ہمارا مقدر بنے گی۔ پچھلے دن مولوی صاحب نے اس کی کتنی فضیلت بیان کی۔ عبد الولی نے کہا۔

عبد الولی ایک کہات مشہور ہے کہ "جنگ کی باتیں میٹھی اور میدان کڑوا ہے" یہ باتیں کہنے میں تو آسان ہیں مگر اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔ اللہ داد نے کہا۔ اللہ داد اخوند! اس زندگی نے ہمیں دیا کیا ہے، جسے ہم نے اتنا قریب تر بنایا ہے، اگر اللہ کی راہ میں قربان کر دیں تو آخرت میں تو کام آئے گی۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

کیوں یہ کام جو ہم کر رہے ہیں کیا یہ آخرت میں ہمارے کام نہیں آئے گا؟ اللہ داد نے پوچھا۔

کیوں نہیں آئے گا۔ صرف خود کیلئے، جہاد تو پورے عالم اسلام کیلئے فائدہ پہنچائے گا۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

مانتا ہوں تمہاری بات بھی ٹھیک ہے۔ مگر اسے اُس طرح کی قیادت کی ضرورت ہے جو عوام کو یہ بتا سکے کہ جہاد کے فوائد کیا ہیں؟ ہمارے ہاں تو ہر فرد ہر ایک طبقہ حکمرانی چاہتا ہے۔ مولویوں نے اپنے کام اس کیلئے چھوڑ دیے ہیں، عام آدمی نے اس کیلئے اپنا کام چھوڑا ہے، یہ تمام ملک کی خدمت حکمرانی میں دیکھ رہے ہیں۔ اللہ داد نے کہا۔

یار چھوڑو تمہاری باتیں، اگر اتنے ہوشیار ہوتے تو آج مولوی صاحب کی جگہ پر ہوتے۔ مولوی صاحب کی باتیں بھول گئے، فرما رہے تھے کہ اس وقت قیادت اچھے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ عبد الولی نے اپنی بات پر زور دیا۔

ہمارا اصل کام یہ ہے کہ علم حاصل کریں، یہ علیحدہ بات ہے کہ نہ تو ہم خود سمجھتے ہیں اور نہ اساتذہ، تم کہہ رہے ہو تو ٹھیک ہے، میں نے تو ہر جگہ ہر وقت تمہارا ساتھ نبھایا ہے۔ اور آج بھی تمہارے ساتھ ہوں، آج سے کتاب بند۔ اللہ داد نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا۔

دوسری صبح مدرسہ کا مہتمم بہت خوش تھا۔ اس لیے کہ وہ آج اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ دیگر طالبان کو بھی بلایا گیا تھا۔ دس طالبان کا ایک گروپ تیار ہو چکا تھا۔ پھر اُس نے دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے۔

یا اللہ! ہم سب آپ کے بندے ہیں، آپ ہی کی عبادت کیلئے پیدا ہوئے ہیں، اور یہ عہد کیا ہے کہ آپ کے احکامات بجالائیں گے، اور دوسرے لوگوں تک پہنچائیں گے، آج وہ دن آگیا ہے کہ ہم دین کا علم بلند کریں اور اس راہ میں اپنی جانوں کا نظر انداز پیش کریں۔ یہ ٹولہ اپنی دربار میں قبول فرما۔ فتح ان کا مقدر بنا۔ یا اللہ! وہ ہمت عطا فرماتا کہ دین مبین پر سب کچھ قربان کر سکیں۔ صرف آپ کے دین کی راہ میں نکل رہے ہیں، یا اللہ! انہیں قبول فرما۔ آمین۔

دعا کے بعد ہر ایک طالب کو ماتھے پر چوما۔ اللہ داد کی قیادت میں انہیں رخصت کیا۔ دو مہینے ان لوگوں سے جنگ کی ٹریننگ حاصل کی جنہیں پشتوزبان بولنی نہیں آتی تھی۔

وعلیکم السلام! آؤ پہلوان، دروازے میں کیوں کھڑے ہو۔ آؤ بیٹھو۔ مولوی صاحب نے کہا۔

پہلوان نے بھی جوتے اتارے اور کمرے میں جا کر مولوی صاحب کے قریب بیٹھ گیا۔

پہلوان کیا حال ہے، بال بچے ٹھیک ہیں، اور عبد الولیٰ کا کچھ پتہ چلا؟ مولوی صاحب نے پہلوان سے پوچھا۔

مولوی صاحب! اللہ کا شکر ہے بچے ٹھیک ہیں، رات کا نوالہ مل جاتا ہے، وہ ولی کی امی۔۔۔۔

منہ میں خاک۔ نہ آدمی تھے اور نہ بنو گے۔ ولی کوئی نام ہے جو تم نے لیا، پورا نام کیوں نہیں لیتے۔ آدھا نام لینا یا پھر نام بگاڑنا گناہ ہے۔ کتنی بار تم لوگوں سے کہا ہے تم لوگ سمجھتے نہیں۔ مولوی صاحب نے پہلوان کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

ہاں وہ عبد الولیٰ کی ماں کیا کہتی ہے۔ مولوی صاحب نے پہلوان کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

میں کہہ رہا تھا کہ عبد الولیٰ کی ماں پریشان ہے، عبد الولیٰ کا کوئی اتہ پتہ معلوم نہیں، پہلے تو حال احوال تھا، اب جب ہم ملنے جاتے ہیں تو وہ وہاں سے جا چکا ہوتا ہے۔ اب تو بیس سالوں سے کوئی حال احوال نہیں۔ پہلوان نے اپنی بات پوری کی۔

میں آس پاس معلوم کرتا ہوں، جس مدرسہ میں بھی تھا معلوم ہو جائے گا۔ پرسوں جمعہ ہے، نزدیک کے گاؤں کے مدرسہ میں دو مدارس کے کچھ علماء آرہے ہیں، اُن سے بھی معلوم کر لوں گا۔ تم اُس کی ماں کو تسلی دو۔ مولوی صاحب نے کہا۔

پہلوان واپس اپنے گھر آیا۔ عبد الولیٰ کی والدہ خال دارہ کو مولوی صاحب کی باتیں بتائی۔ اُنہیں تھوڑی تسلی ہو گئی۔ دوسری صبح پہلوان کے بھائی کے گھر سے کچھ لڑکیاں دعوت دینے

کیلئے پہلوان کے گھر آئیں۔ خال دارہ اور اُس کی بیٹی کو بھی دعوت دی کہ جمعہ کے دن سلیم کی منگنی ہے آپ لوگ ضرور آئیں۔ سلیم کی بہن مرجان تو اتنی خوش تھی کہ پورے گاؤں کو اس منگنی میں مدعو کرے۔ دن رات ناچ گانا اور طبل بجائے۔ بختاور نے جب مرجان کا یہ جوش دیکھا تو اُن سے کہا

مرجان! آج تو تم بہت خوش ہو، خوشی کے مارے پھولے نہیں ساری۔

کیوں خوش نہیں ہو گی۔ بڑے بھائی کی منگنی ہے، دل چاہ رہا ہے کہ دن رات ناچوں، بہنیں تو یہ دن خدا سے مانگتی ہیں۔ مرجان نے اُسی جوش میں کہا۔

کس کا ہاتھ مانگا ہے؟ بختاور نے پوچھا۔

وہ ساتھ والے گاؤں کے ملک صالح کی بیٹی زر قاہے۔ بہت امیر لوگ ہیں۔ اور لڑکی، وہ تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ مرجان نے فخریہ انداز میں کہا۔

دولت اور خوبصورتی کو کیا کرو گی، اللہ سیرت اچھی کرے۔ خال دارہ نے کہا۔

چچی آپ کو کیا پتہ، آج کل لوگ لڑکی کے سگڑپن کو نہیں صورت کو دیکھتے ہیں، پھر میرے بھائی سلیم کو دیکھو، وہ کونٹہ میں پڑھ رہا ہے۔ وہی نوکری ہو گی، اب بھی وہ ایک جگہ نوکری کر رہا ہے، بہت بڑی تنخواہ دے رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے اپنے ساتھ لے جائے، ہو سکتا ہم بھی شہر چلے جائیں۔ شہر میں تو اس طرح کے کام نہیں ہوتے جیسے یہاں گاؤں میں ہیں۔ مرجان نے جواب دیا۔

خدا نہ کرے کہ ماں باپ سے علیحدہ ہوں۔ ماں باپ تو لڑکے اس لیے نہیں مانگتے کہ وہ شادی کر کے علیحدہ ہو جائیں، زینہ اولاد تو ماں باپ کے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں۔ خال دارہ نے جواب دیا۔

چچی! میرے والدین کو تو کسی چیز کی کمی نہیں۔ سب کچھ بہت ہے۔ سلیم نے جو اتنی پڑھائی کی ہے وہ تو اُسے گاؤں کی خاک کے ساتھ نہیں ملا سکتا۔ مرجان نے اپنی چچی کو یوں جواب دیا جیسے وہ بہت جانتی ہو۔

آپ لوگ باتیں کریں میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔ بختاور اٹھتے ہوئے بولی۔
نہیں جانے دو، ہم دعوت دینے نکلے ہیں دیر ہو جائے گی۔ مرجان نے اٹھتے ہوئے کہا۔
بختاور تم بھی ہمارے ساتھ چلو، آخر تمہارا بھی تو چچیرا ہے۔ اتنا حق تو بنتا ہے۔ گاؤں کی ایک لڑکی نے بختاور سے کہا۔

بختاور نے مرجان کی طرف دیکھا مگر اُس نے لڑکیوں سے کہا۔ چلو بھئی دیر ہو رہی ہے اور بھی بہت سے کام باقی ہیں۔

پھر خال دارہ کو متوجہ کر کے کہا، چچی! آپ اور بختاور ضرور آنا۔ پھر لڑکیوں کے ساتھ گھر سے نکل گئی۔

خال دارہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بیٹی نے جب ماں کو دیکھا تو اس کا دل بھی بھر آیا اور ماں سے لپٹ گئی۔ ہم بھی طالب لالا کی منگنی کریں گے۔ میں اور گل پانزا اسی طرح دعوت دینے نکلیں گی۔ بختاور نے اپنی ماں سے کہا۔

ہماری یہ قسمت کہاں بیٹا۔ ہماری قسمت میں تو صرف مشقت لکھی ہے۔ ناپیٹ بھر کر کھانا کھایا اور ناہی اپنی خوشی دیکھ سکے۔ بس اللہ نے ہمیں دوسروں کی خوشی میں برتن دھونے کیلئے پیدا کیا ہے۔ خال دارہ کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگے۔

کیوں نہیں دیکھیں گے۔ اللہ تو صرف ان کا نہیں ہے۔ اللہ نے کیا تو طالب لالا مولوی بن کر آجائے گا، تمام خوشیاں وہ اپنے ساتھ لے آئے گا۔ بختاور نے اپنی ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

آمین۔ تمہارے میں منہ میں گھی شکر۔ خال دارہ نے رونے کے انداز میں کہا۔

جمعہ کے دن سلیم کی منگنی دھوم دھام سے ہوئی۔ باہر ڈھول اور گھر میں طبل بچ رہے تھے۔ ہر طرف علاقائی رقص (اترنز) تھا۔ پہلوان اور اُس کے بیٹے لوگوں کی خدمت کر رہے تھے۔ مبارک باد دیے کیلئے آئے ہوئے لوگوں کے سامنے چائے پیش کر رہے تھے۔ پہلوان کا بھائی لعل محمد گرچہ پہلوان سے چھوٹا تھا مگر دولت نے اُسے بڑا بنایا تھا۔ گاؤں کے لوگ بھی پہلوان کو چھوٹا اور لعل محمد کو بڑے کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ دو دن بعد مولوی صاحب آگئے، انہوں نے پہلوان کو اپنے کمرے میں بلایا۔

پہلوان! مبارک ہو تمہارے بیٹے کا پتہ چل گیا ہے۔ مولوی صاحب نے پہلوان کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا۔

خدا آپ کا ایمان سلامت رکھے، کہاں ہے وہ، کیسا ہے۔ پہلوان بے چین ہوا۔ وہ مہینہ ہوا کہ طالبان کے ساتھ افغانستان گیا ہے۔ مولوی نے خوش ہوتے ہوئے جذباتی انداز میں کہا۔

افغانستان گیا ہے، طالبان کے ساتھ؟ پہلوان نے حیران ہو کر مولوی صاحب کی طرف دیکھا۔

پہلوان! تم خوش قسمت ہو، کہ عبد الولی جیسا بیٹا اللہ نے دیا ہے۔ اس جیسے بیٹے اللہ ہر کسی کو دے۔ مولوی صاحب نے پہلوان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ افغانستان میں وہ کیا کر رہا ہے، طالبان افغانستان بھی جاتے ہیں؟ پہلوان نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

تم بھی کمال کرتے ہو، تمہیں تو کچھ بھی پتہ نہیں، لوگوں سے تو سنا ہو گا۔ پہلوان! طالبان افغانستان میں اسلامی حکومت بنا رہے ہیں۔ جہاد میں مصروف ہیں، یہاں سے بھی طالبان جا رہے ہیں۔ مولوی صاحب نے کہا۔

تو پھر مولوی صاحب! درس کا کیا ہوا؟ پہلوان نے پوچھا۔

درس کہیں نہیں بھاگا جا رہا، اس وقت جہاد کی بہت سخت ضرورت ہے۔ اور اس طرح کی جو انوں کی ضرورت ہے جیسے عبد الولی جسے دین کا بھی پتہ ہے۔ مولوی نے کہا۔
 وہ تو کہہ رہے تھے کہ افغانستان میں جہاد ختم ہو گیا ہے، کافروں کو انہوں نے بھگا دیا ہے اور مجاہدین نے افغانستان پر قبضہ کر لیا ہے، تو پھر یہ کونسا جہاد ہے؟ کیا افغانستان میں پھر سے کافر آگئے ہیں؟ پہلوان نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

پہلوان! یہ لوگ کافروں سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں، ہر جگہ ڈورے ڈالے لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ نہ مرد دیکھتے ہیں نہ عورت، نہ دن نہ رات، جس کے پاس بندوق ہے اور کچھ لوگ، بس وہ بادشاہ ہے۔ جو دل میں آیا وہی کرتے ہیں۔ ان طالبان کو اللہ فتح یاب کرے یہ تو ان ظالموں کے خلاف کھڑے ہوئے ہیں۔ ان ڈاکوؤں کے خلاف جنہوں نے بڑی شاہرائیں قبضہ کر رکھی ہیں۔ جو لوگوں کے گھروں کو لوٹتے ہیں، کسی کی عزت محفوظ نہیں، ان سب سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے افغانستان میں اسلامی نظام لایا جا رہا ہے اور پھر یہ روشنی اللہ ہم تک بھی پہنچا دے گا۔
 مولوی صاحب نے پوری تقریر کر ڈالی۔

پہلوان کو مولوی صاحب کی ایک بات بھی سمجھ نہیں آرہی تھی، بس اتنا سمجھ گیا کہ عبد الولی مدرسہ چھوڑ کر افغانستان جہاد کیلئے گیا ہے۔

(A)

عبدالولی اللہ داد کی قیادت میں آگ جیسے گرم میدان جنگ تک پہنچ گیا۔ پہلی بار جب وہ قدم ہار پھینچے تو انہیں ایک دفتر لے جایا گیا۔ وہاں ایک طالب بیٹھا لوگوں کے مسائل سن رہا تھا۔ پھر وہ دوسرے ساتھیوں کو حکم دیتا، جیسے ہی ان پر نظر پڑی تو کہا، آپ لوگ تھوڑا سا انتظار کریں جیسے ہی میں فارغ ہو جاؤں تو پھر گپ شپ کریں گے۔

عبدالولی اور اللہ داد یہی دفتر میں بیٹھے رہے باقی ساتھی باہر بیٹھ گئے۔ ان کیلئے سبز قہوہ چائے ٹافیوں سمیت لائے گئے۔ اسی اثنا ایک شخص کاغذ ہاتھ میں لیے دفتر کے اندر داخل ہوا۔

السلام علیکم!

وعلیکم السلام۔ طالب نے جواب دیا۔

کہو کیسے آنا ہوا۔

صاحب یہ ایک عرض ہے اگر آپ اس پر غور فرمائیں۔ شخص نے کہا۔

کیسی عرض؟ کہو کیا بات ہے۔ طالب نے پوچھا۔

یہ لیں جی! اس کاغذ میں لکھا ہے۔ شخص نے کاغذ آگے کیا۔

تم لوگ کبھی نہیں سدھر وگے، پھر وہی یہود و نصاریٰ کے کام۔ طالب نے شخص کو غصے

سے کہا۔

صاحب! میں نے تو ایسا کوئی کام نہیں کیا، میں تو لیسہ (سکول) میں معلم ہوں۔ شخص

نے بڑی عاجزی سے کہا۔

یہ کیا ہے؟ طالب نے شخص کے ہاتھ سے کاغذ چھینا۔ یہ ہیں نصاریٰ کے کام۔ کاغذ پر

عرضداشت لکھتے ہو۔ طالب نے کاغذ پھاڑ دیا۔

میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں کہو کیا مشکل ہے، اسی وقت تمہارا کام ہو جائے گا۔ اس

کا کیا مطلب؟ اگر کاغذ کے لوگ کام کرتے تو یہ ملک اس طرح برباد نہ ہوتا۔

شخص نے اپنی عرض پیش کی۔ جب باہر نکل گیا تو باہر بیٹھے عبدالولی کے ساتھ آئے ہوئے طالبان میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔

میرا خیال ہے یہ سفید کبوتر ہیں جو اس درخت میں بیٹھے ہیں۔
نہیں! یہ کبوتر نہیں، سفید کوچ ہیں۔ میرے خیال سے کوئی انکا شکار نہیں کرتا۔
دوسرے نے کہا۔

یہاں کسی کا باپ بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم دیکھ نہیں رہے ہر کوئی اپنے راستے پر سیدھا جا رہا ہے۔ ایک اور طالب نے کہا۔ جو شخص ان کے سامنے چائے رکھ رہا تھا وہ مسکرایا اور کہا۔
ناہی یہ کبوتر ہے اور ناہی کوچ۔ یہ تو اس دفتر کے کاغذات ہیں جو صاحب نے ادھر پھینکے ہیں۔ جب صاحب اس دفتر میں آئے تو کوئی دس دن ہوئے کہ یہ تمام کاغذات پھینک دیے۔
ابھی ان درختوں پر لٹک رہی ہیں۔ چائے والے شخص نے کہا۔

معلم صاحب نے جب ان کاغذوں کو دیکھا تو انہیں ٹھیس سی پہنچی۔ کیونکہ ان کے پاس بھی لوگ آئے تھے کہ جب تک ہم پوری طرح حکومت حاصل نہیں کر لیتے تھیں یہ لیسہ (سکول) بند کرنا ہو گا۔ معلم صاحب کا خیال تھا کہ جو لوگ ان کے پاس آئے تھے شاید وہ اپنے طور سے آہیں ہونگے۔ اس لیے انہوں نے یہاں عرضی پیش کی۔

جو طالب دفتری امور سنبھال رہا تھا انہوں نے اللہ داد اور عبدالولی سے کہا کہ تم لوگ اپنے ساتھیوں سمیت اس معلم کے لیسہ جاؤ گے جو ابھی یہاں سے گیا ہے۔ وہاں تم لوگ اپنا اوطاق بناؤ پھر انشاء اللہ قائدین کی رائے کے مطابق تم لوگوں کو آگے کی حکمت عملی بتائی جائے گی۔
لیسہ میں کیسے اوطاق بنائیں، وہاں تو بچے پڑھ رہے ہونگے۔ اللہ داد نے پوچھا۔

یہ لیسہ تو مجاہدین نے ہی بند کیا تھا۔ یہاں تو وہ چرس وغیرہ اور دوسرے تماشے کیا کرتے تھے۔ پھر اس معلم نے کہا کہ وہاں اب کوئی نہیں، دو مہینے ہوئے ہیں کہ پھر سے لیسہ شروع

کر ادیا گیا ہے۔ جب تک ہم از سر نو درسی نصاب نہیں بناتے تب تک ان سے اوطاق کا کام لے سکتے ہیں۔ پکے کمرے ہیں اُس میں۔ طالب نے کہا۔

یہ لیسہ کسے کہتے ہیں؟ عبد الولی نے پوچھا۔

سکول کو یہاں لیسہ کہا جاتا ہے۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

یہ تو اچھی بات ہے، سکول کی کیا ضرورت، ہم تو وہاں ان لوگوں سے تنگ آچکے ہیں، ہمارا مذاق اڑاتے ہیں، فضول ناموں سے پکارتے ہیں۔ آپ نے اچھا فیصلہ کیا ہے۔ عبد الولی نے کہا۔

حافظ صاحب! وہاں کی بات اور، اور یہاں کی بات اور ہے۔ اللہ داد نے کہا۔

آپ لوگ وہاں جائیں میں ایک آدمی کو آپ کے ساتھ بھیجتا ہوں۔ طالب نے ان کی

بات کاٹ دی۔

پھر اس نے ایک شخص کو بلایا، وہی شخص جو چائے پیش کر رہا تھا اُس نے کہا کہ تم ان لوگوں کو آج رات اخوند صاحب کے ہاں لے جاؤ، وہاں جگہ کم ہے مگر اُن سے کہنا کہ آج رات انہیں اپنے ہاں ٹہرائے، کل صبح انہیں لیسہ لے جانا ہے۔

دوسری صبح یہ لوگ لیسہ آگئے۔ لیسہ کی عمارت گرچہ خراب ہو چکی تھی پھر بھی انہوں نے کچھ مرمت وغیرہ کی تھی۔ دیواروں پر علم کے بارے میں اقوال تازہ تازہ لکھے گئے تھے۔ یہ اقوال سفید چارٹ پر لکھے گئے تھے۔

علم روشنی ہے۔ جہالت اندھیرا ہے۔

آؤ اپنے ملک کی خدمت قلم کے ذریعے کریں۔ بندوق پھینک دیں وغیرہ وغیرہ۔

انہوں نے معلم صاحب اور بچوں کو رخصت کیا اور اپنا ٹھکانا بنایا۔ اور لوگ بھی یہاں آتے اور یہاں سے آگے اپنے کام کیلئے بھیجے جاتے۔ عبد الولی اور اُس کے ساتھی بھی کچھ دنوں بعد میدان جنگ بھیج دیے گئے۔

(۹)

اللہ داد اور عبد الولیٰ ہر میدان جنگ میں بڑی دلیری سے لڑے۔ پورے ڈیڑھ دو سال مختلف محاذوں پر رہے۔ تحریک طالبان کامیابی کے ساتھ اس وقت بہت آگے تک بڑھ چکی تھی۔ ان دونوں کو واپس قندہار بھیجا گیا۔ وہاں امن وامان قائم کرنے انہیں ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

عبد الولیٰ اپنے اوطاق میں اپنے بستر کے تکیہ پر بیٹھا گھٹنوں میں سر رکھے گہری سوچوں میں گم تھا۔ دو سال ہونے کو تھے کہ یہاں آئے۔ ان دو سالوں میں اُس نے بہت کچھ سنا اور بہت کچھ دیکھا۔ دشتِ لیلیٰ کے شہید اور اُن کا جذبہ۔ جو دس ساتھی یہاں آئے اُن میں صرف تین رہ گئے تھے۔ ایک عبد الولیٰ دوسرا اللہ داد اور تیسرا ایک اور ساتھی۔ ان کے تین ساتھیوں نے دشتِ لیلیٰ میں جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ اور باقی چار ساتھی دوسرے محاذوں پر شہید ہوئے تھے۔ دشتِ لیلیٰ میں ان کا ساتھی اللہ نور جو کہ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا بڑی بے رحمی سے مارا گیا تھا۔ جب انہیں کمانڈر مالک نے راستہ دیا وہ آگے بڑھنے لگے تو اُزبک ملیشیا کی جال میں پھنس کر مارا گیا۔ عبد الولیٰ کی حالت بھی بہت گھمبیر تھی اور اللہ نور شہید ہوا۔ عبد الولیٰ اتنا بے بس تھا کہ وہ اللہ نور کو دفن بھی نہ سکا۔ اللہ نور کی موت داغ ایسا گہرا تھا کہ عبد الولیٰ بھولے نہیں بھول پارہا تھا۔ ان کی قربانیاں رنگ لارہی تھی۔ تحریک طالبان کابل کے قریب پہنچ چکی تھی۔ امکان یہی تھا کہ بہت جلد افغانستان کا دار الحکومت کابل ان کے قبضہ میں آجائے گا۔ عبد الولیٰ جو نفرت اپنے ساتھ لایا تھا اُس کی برکت سے طالبان میں بڑا نام کما لیا تھا۔ کیونکہ نہ تو اُس کے پاس دل تھا اور نہ ہی وہ کسی پر رحم کھاتا۔

میرے خیال سے گھریا آ رہا ہے۔ جو اس طرح گہری سوچ میں گم ہو۔ اللہ داد جو تھوڑی دیر پہلے آیا تھا عبد الولیٰ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

ہو نہہ، گھر۔۔۔ گھر کیا ہوتا ہے۔ کیسا ہوتا ہے۔ اس سے ہمارے جیسے لوگ انجان ہوتے ہیں۔ گھر تو اُن کے ہوتے ہیں جو گھروں میں پلے بڑے ہوں۔ ہم تو تجروں میں رہنے والے،

دوسروں کے ٹکڑوں پر پلٹنے والے ہیں۔ ہمارے گھر تو حجرے ہیں اور حجروں کی کمی یہاں نہیں ہے۔

آج تو بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو۔ اللہ داد عبد الولی کے قریب بیٹھ گیا۔ خیر ہے رات کو کیا خواب دیکھا تھا۔ اللہ داد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔
تم بھی بادشاہ ہو اللہ داد اخوند۔ خواب تو وہ دیکھتے ہیں جنہیں نیند آتی ہے۔ میں تو صرف سو جاتا ہوں اور بس۔ خوابوں کی دنیا انسان کو حقیقت سے دور کرتی ہے۔ حقیقت کیا وہ تو جنت سے بھی دور کرتی ہے۔ عبد الولی نے کہا۔

عبد الولی اخوند! کئی سال ہم نے اکٹھے گزارے، مدرسہ کے سرد کمرے سے لے کر اس گرم میدانِ جنگ تک۔ مگر میں تمہیں آج تک نہیں پہچان سکا۔ اللہ داد نے کہا۔
مجھے نہیں پہچانا! میں عبد الولی۔ عبد الولی زور زور سے ہنسنے لگا۔ یار اللہ داد تم بھی کمال کرتے ہو کہ مجھے نہیں پہچانا۔ تو مجھے پہچان لو۔ نام عبد الولی، ولد داد محمد۔ مدرسہ میں دوسروں کے ٹکڑوں پر پلا بڑا ہوں۔ تمہارے سوامیرا کوئی اور دوست نہیں اور بس۔
عبد الولی اخوند! میرا یہ مطلب نہیں۔ عبد الولی کو تو اب ہر طالب جانتا ہے۔ حافظ قرآن عبد الولی۔ جس پہچان کی میں بات کر رہا ہوں وہ کچھ اور ہے۔

کیسی پہچان؟ اللہ داد اخوند میں کچھ سمجھا نہیں۔ عبد الولی نے حیرانی سے پوچھا۔
میں نے سنا ہے کہ جس کے سینے میں قرآن ہو وہ بہت رحم دل ہوتا ہے۔ صلہ رحمی رکھتا ہے، اس طرح کے لوگ بہت نرم اور رحم دل ہوتے ہیں۔ جب کہ تمہارا دل مجھے پتھر سے بنا لگتا ہے جس پر نہ کسی کے آنسو اثر کر سکتے ہیں اور نہ کسی کی فریاد۔ اللہ داد نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔

میرا دل پتھر کا ہے۔ کیا وجہ ہے۔ تم کیوں یہ سوچتے ہو۔ میں نے تو تمہیں

کچھ

نہ، اللہ داد نے عبد الولی کی بات کاٹی۔ تم نے مجھے ہمیشہ بڑے بھائی کی نگاہ سے دیکھا۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے ہیں۔ اللہ نور کی شہادت پر آج بھی جب اللہ نور کا ذکر چھڑتا ہے تو تمہاری آنکھیں اشک بار ہو جاتی ہیں۔ اللہ داد نے عبد الولی کے شکوک دور کیے۔ تو پھر تم نے یہ بات کیوں کہی؟ عبد الولی نے پوچھا۔

جب تمہارے کاندھے پر کلاشکوف ہوتی ہے اور تم ڈیوٹی پر ہوتے ہو یا پھر میدان جنگ میں جہاد کر رہے ہوتے ہو تو اُس وقت میں نے محسوس کیا ہے جیسے تمہارے سینے میں دل نہیں پتھر ہو۔ عورتوں سے تمہاری نفرت دکھائی دے رہی ہوتی ہے۔ اگر وہ بیچاری برقعہ میں بھی ہوتی ہیں تو تم انہیں نہیں چھوڑتے۔ اور اگر وہ بنا منہ چھپائے دکھائی دیں تو تمہارے چہرے کی رنگت اڑ جاتی ہے جیسے عورت تمہاری سب سے بڑی دشمن ہو۔ اور جو انوں سے بھی تمہارا رویہ اسی طرح ہے جو سکول پڑھتے ہیں۔ اللہ داد نے وجہ کی نشاندہی کر دی۔

عبد الولی زور زور سے ہنسنے لگا۔

یہ صرف میرا نہیں تمام طالبان کا مسئلہ ہے۔ اللہ داد اخوند! یہ دونوں فتنے ہیں فتنے۔ یہ جتنی جلدی ختم کرو گے اتنی جلدی کامیابی حاصل کرو گے۔ یہ انسان کو بے راہ کرتے ہیں۔ تم نے سنا ہو گا کہ عورت شیطان کی ذات سے ہے۔ سمجھے کہ نہیں۔ عبد الولی نے اپنا جواز پیش کیا۔

شرم کرو، تم بھی جاہلوں جیسی باتیں کرنے لگے ہو۔ عورت شیطان کی ذات سے ہے یہ کیا بات ہے جو تم نے کہی۔ افسوس اُس درس کا جو تم نے لیا تھا۔ اللہ داد نے مایوسی میں کہا۔ اللہ داد اخوند! ہر جگہ اسی کی وجہ سے فساد پھیلا ہوا ہے۔ بابا آدم کس کے کہنے پر جنت سے محروم ہو گئے؟ عبد الولی نے پوچھا۔

واہ، اچھی دلیل ڈھونڈی ہے۔ عورت تو خدیجہؓ بھی تھیں۔ عائشہؓ بھی تھیں، ان کے بارے میں کیا خیال ہے۔ اللہ داد نے کہا۔

کیوں گنہگار کرتے ہو، گنہگار ہو جائیں گے، چھوڑو یہ باتیں۔ عبد الولی نے جان چھڑانے کیلئے کہا۔

اپنی ماں اور بہن کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اللہ داد نے پھر پوچھا۔
مجھے میری ماں اور بہن کے پاس کسی نے چھوڑا ہے، اُن کا پیار میری قسمت میں کہاں،
میری تو ساری زندگی تمہارے ساتھ گزری ہے۔ عبد الولی نے کہا۔

میرے خیال میں تم ان سب کا بدلہ لینا چاہتے ہو۔ اللہ داد نے کہا۔
دونوں اور بھی باتیں کرتے کہ اُنہیں خبر پہنچی کہ والی صاحب نے اُنہیں بلایا ہے۔
دونوں نے اپنے اپنے عمامے باندھ لیے، والی صاحب کے دفتر کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں صوبے
کا کمانڈر بھی موجود تھا۔ دوسرے اضلاع کے ذمہ داران بھی آئے ہوئے تھے۔ والی صاحب کی
صدارت میں میٹنگ ہوئی۔ والی صاحب عبد الولی سے بہت خوش ہے۔ ایک ضلع کے امیر نے اپنے
ضلع کیلئے عبد الولی کی خدمات چاہیں۔ والی صاحب نے اُن کی بات مان لی۔ اور عبد الولی کو اس ضلع کی
" امر بی المعاروف و نہی عن المنکر " کی امارت سونپی گئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ نئے
آئے ہوئے طالبان کی ذمہ داری بھی دے دی گئی۔ والی صاحب نے اُن سے کہا کہ حافظ صاحب!
کچھ نئے طالبان آئے ہیں کل ان کے ساتھ ایک نشست کر لیں۔ جہاد کی فضیلت اور تحریک کے
مقاصد کے بارے میں اُنہیں اچھی طرح سمجھائیں۔ یہ کام اب تمہارے ذمے ہے۔ جب تک وہ
میدان جنگ کیلئے تیار نہیں ہوتے اُنہیں ذہنی طور پر تیار کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اللہ داد نے
والی صاحب جو کہ ایک سنجیدہ اور مولوی تھے سے پوچھا۔ والی صاحب! اگر یہ ذہنی تیاری کا کام آپ
جیسے عالم فاضل شخص خود کرے اچھا نہیں ہوگا۔ عبد الولی اخوند جوان ہے اور پھر اس نے
علم

یہ کام ہے جو ان کا۔ اور پھر عبد الولیٰ کو طالبان میں قدر کی نگاہ دیکھا جاتا ہے۔ یہ کام اچھی طرح سرانجام دے سکتا ہے۔ میدان جنگ میں علم کی نہیں جنگی ہنر اور جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ چیز مجھے عبد الولیٰ میں نظر آرہی ہے۔ والی صاحب نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ اللہ داد گرچہ والی کی باتوں سے متفق نہیں تھا پھر بھی ہاں کے انداز میں سر بلا دیا۔ صوبائی دفتر سے جب وہ باہر نکلے تو اللہ داد نے عبد الولیٰ سے کہا۔

عبد الولیٰ اخوند! تم سمجھتے نہیں کہ تمہیں بہت بڑی ذمہ داری سونپی گئی ہے، کیا پورا کر پاؤ گے؟

اللہ داد اخوند! تمہیں تو خوش ہونا چاہیے تمہارے دوست کو اختیارات حاصل ہوئے ہیں۔ اب دیکھو میں کیسے اپنی ذمہ داری اچھی طرح سرانجام دیتا ہوں۔ عبد الولیٰ اپنے نئے عہدے پر بہت خوش تھا۔

عبد الولیٰ اخوند میں سمجھا نہیں؟ کونسے اختیارات، کن اختیارات کی بات کر رہے ہو؟ اللہ داد کچھ پریشان سا ہوا۔

یہ اختیارات، کہ لوگوں کو بُرائی سے منع کروں اور اچھائی کی طرف بلاؤں۔ عبد الولیٰ کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ سی ابھری۔

تمہیں پتہ بھی ہے کہ یہ ذمہ داری کتنی دانائی اور احتیاط کی حامل ہے۔

اللہ داد کچھ کہنا چاہتا تھا کہ عبد الولیٰ نے بیچ میں بات کاٹ ڈالی۔

کیوں مجھے جاہل سمجھتے ہو، یا پھر میں بے راہ ہوں۔ اور کسی چیز کا علم نہیں رکھتا۔ تم بھی عام لوگوں کو طرح طالب کو جاہل کی نظر سے دیکھتے ہو۔ عبد الولیٰ نے اپنی ذہنی حالت کی نشاندہی کی۔

میں سمجھتا ہوں کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ نہ میں تمہیں جاہل سمجھتا ہوں اور نہ لوگ طالبان کو جاہل سمجھتے ہیں۔ یہ صرف ہمارے طالبان کا گمان ہے کہ لوگ ہمیں جاہل سمجھتے ہیں اور

چاہئے بھی یہی کہ لوگ ہمیں جاہل سمجھیں۔ تم یہ مانتے ہو کہ تم حافظ قرآن ہو؟ اللہ داد نے سوالیہ انداز میں کہا۔

اس میں کوئی شک؟

میں مانتا ہوں۔ اللہ داد نے کہا۔

اُس کے بعد ارشاد الصراف تک کتابیں پڑھیں۔ یہ ایک حقیقت ہے تم صرف حافظ قرآن ہو، قرآن کو سمجھتے تو نہیں۔ اُس کی معنی کو نہیں سمجھتے۔ سمجھتے ہو؟ اللہ داد نے پوچھا۔

یار اللہ داد! خوند! اچھا بُرا کون نہیں سمجھتا۔ اس میں قرآن کو سمجھنا یا پھر حدیث کو سمجھنا ضروری تو نہیں۔ میں کوئی شیخ الاسلام تو نہیں بنا، اتنا سمجھتا ہوں کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔ یہ سب مدرسہ میں سیکھا ہے۔ نیکی اور گناہ میں کیا فرق ہے۔ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا ہے۔ یہ تمام عبد الولی نے اپنی دلیل کے طور پر کہے۔

تم نے بڑا آسان کر دیا۔ تمہیں جو ذمہ داری سونپی گئی ہے وہاں اچھا بُرا، گناہ نیکی نہیں۔ اسے تو ایک عام شخص بلکہ ایک بچہ بھی سمجھتا ہے۔ تمہاری ذمہ داری ہے کہ تمہیں قرآن و حدیث کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔ دینی و عصری علوم کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔ یہ بات صرف عبادت تک محدود نہیں، اس میں معاملات آتے ہیں، اور معاملات کے بارے میں مجھے پتہ ہے کہ تمہاری سوچ کیا ہے۔ اللہ داد نے بات کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

میری سوچ کیا ہے؟ کیا میں نے لوگوں کو تکلیفیں پہنچائی ہیں۔ کسی کا مذاق اڑایا ہے، کسی کے ہاتھ سے نوالہ چھینا ہے یا پھر کسی کو کام سے روکا ہے۔ مجھے جو اچھا لگا ہے میں نے وہ کیا ہے۔ عبد الولی نے کچھ غصے سے کہا۔

میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ تمہاری سوچ اچھے اور بُرے کا میعار نہیں ہے۔ تمہاری سوچ اگر اچھی ہو تو وہ کرتے ہو، اسلامی فکر سے زیادہ تم پر اپنی سوچ کا غلبہ ہے۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

کیوں میری سوچ اسلامی نہیں یا میں کسی اور سوچ کا مالک ہوں۔ اس کا مطلب یہ کہ جس نے میری سوچ پر اعتماد کیا وہ بھی غلط تھے۔ ہم سب کی سوچ خالص اسلامی ہے۔ اور پھر میری توساری زندگی مدرسہ میں گزری ہے، اسلامی ماحول میں، تمہارے سامنے۔ پھر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو۔ عبد الوالی نے اسی لہجے میں کہا۔

اسلامی ماحول میں یا پھر روایتی ماحول میں؟ اللہ داد نے پوچھا۔

کیا مطلب اسلامی اور روایتی ماحول؟ عبد الوالی نے پھر پوچھا۔

خیر چھوڑو عبد الوالی اخوند، تم جذباتی ہو گئے ہو۔ یہ باتیں یہیں چھوڑ دیتے ہیں پھر کسی دن اس پر بحث کریں گے۔ اب چلو کھانا کھائیں۔ اللہ داد نے عبد الوالی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
میرے تو یار ہو یار، حجرے کے یار۔ دونوں ہنسنے لگے۔

رات جب عبد الوالی اپنے بستر پر لیٹا تو ایک خوش گوار احساس اُس کے ساتھ تھا۔ بہت خوش تھا۔ گزرا وقت ایک فلم کی طرح اس کی نظروں کے سامنے سے گزرا۔ جن شرائط پر اُس نے زندگی گزاری تھی، جو مشکلات اُس پر گزری تھیں وہ تمام اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گئیں۔ گھر گھر جانا، وظیفے اکٹھا کرنا۔ وظیفہ سے زر قایا آ گئی۔ زر قایا کی معصوم صورت، چمکتی آنکھوں میں اپنے پن کا احساس، شریکِ غم برتاؤ۔

اب زر قاہاں ہو گی؟ ایک دم ذہن میں یہ سوال ابھر آیا۔

اپنے گھر ہو گی اور کہاں ہو گی۔ اپنے سوال کا خود جواب دیا۔

گھر میں کیا کر رہی ہو گی؟

اپنا گھر ہو گا، شادی بھی کر لی ہو گی۔

اس سوال کے ساتھ ہی اچانک منہ سے نکل گیا۔

نہیں، نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ ایک دم وہ اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

کیا نہیں ہو سکتا؟ اللہ داد جو اُس کے ساتھ کمرے میں سو رہا تھا نے سر اٹھا کر پوچھا۔

ہوتی۔ ڈر کے مارے کھڑا ہو جاتا۔ ادھر ادھر دیکھتا سوائے سانپ، گرگٹ اور چھپکلی کے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ پھر رونے لگتا اور روتے روتے جاگ جاتا۔ اور بھی اسی طرح کے ڈراؤنے خواب دیکھتا۔ جس وقت اُس نے قرآن شریف حفظ کر لیا یہ خواب کم دیکھنے لگا۔ مگر دوسرا خواب زیادہ دیکھتا۔ آج بھی جب وہ سویا تو یہی خواب دیکھا۔

خواب میں دیکھ رہا تھا کہ اُس کے سینے میں روشنی ہے، ارد گرد اندھیرا ہے، کچھ بچے اس روشنی میں بیٹھے پڑھ رہے ہیں، ایسی چیز جیسے سانپ مگر اُس کا سر بہت بڑا ہوتا ہے اس کی طرف آرہا ہوتا ہے۔ ایک بچے کو منہ میں اٹھا کر لنگ لیتا ہے۔ اس کے قریب بیٹھے بچوں کے نزدیک آتا ہے۔ جب اس کے سینے کی روشنی پر نظر پڑتی ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ پھر نزدیک آ جاتا ہے اور اپنا بڑا سا منہ کھول لیتا ہے۔ منہ کھولتے ہی اُس کے بڑے پیلے آدھے خون زدہ دانت نظر آ جاتے ہیں۔ عبدالولی ڈر کے مارے چیخ اُٹھتا ہے اور اسی چیخ پر جاگ جاتا۔

مگر آج خواب میں یہ اڑدھا نما سانپ اسی کے ساتھ بیٹھے ایک بچے کو لنگ لیتا ہے، پھر دوسرے بچے کو۔ باقی بچے کتاب پھینک دیتے ہیں اور بھاگ کر اندھروں میں گم ہو جاتے ہیں۔ اڑدھا نما سانپ جب اس کے سینے کی روشنی کو دیکھ لیتا ہے تو اپنا بڑا منہ کھول لیتا ہے۔ عبدالولی ایک دم نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ جب اُس کی آنکھ کھل جاتی ہے تو فجر کی آذان ہو رہی ہوتی ہے اور آذان کے یہ الفاظ اُس کے کان کو چھونے لگتے ہیں۔ (الصلوٰۃ خیر من نوم)۔

وضو کیا، نماز پڑھی، چائے کے ساتھ سوکھی روٹی کھائی، اسی اثناء " امر بی

المعاروف و نہی عن المنکر " کی گاڑی آگئی۔ ڈرا نیور نے کہا

ضلعی امیر نے کہا ہے کہ تم نئے اوطاق پر سامان سمیت جاؤ۔ دس ایسے بندوں کو اس کام میں اپنے ساتھ لے چلو جو تمہاری مدد کر سکیں۔ اور دوسری بات جو نئے طالبان آئے ہیں اُن کی طرف ایک مرتبہ چکر لگالو۔

عبدالولی نے بھی دس آدمی اپنے ساتھ تیار کر لیے اللہ داد کو اپنا نائب مقرر کیا، ایک گاڑی میں ساتھیوں کو سامان سمیت نئے اوطاق پر جانے کو کہا۔ وہ خود نئے طالبان کے اوطاق پر گیا، اوطاق کے امیر نے اچھی خاطر تواضع کی۔ پھر اُن کو طالبان سے متعارف کروایا اور طالبان کو ان سے متعارف کروایا۔ تعارف کے بعد عبدالولی نے طالبان کے سامنے یوں تقریر شروع کی۔

میرے عزیز بھائیو اور شیدایانِ دین مسلمانوں! آپ لوگوں کا اپنا گھر بار چھوڑ کر یہاں آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ لوگ دینِ مبین سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص دین کیلئے جانی قربانی دینے کیلئے تیار ہوتا ہے اس کی دین کے ساتھ محبت پر شک کرنا (نعوذ باللہ) خدا کی خدائی پر شک کرنا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ آپ لوگ سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئے ہیں، ایک خاص مقصد کیلئے۔ وہ خاص مقصد دینِ اسلام کی سر بلندی ہے۔ آپ لوگ مسجدوں یا پھر مدارس سے آئے ہونگے۔ وہاں آپ لوگوں کو دین و دنیا میں فرق واضح طور پر معلوم ہو گا۔ وہ لوگ یعنی ہمارے ماں باپ جنہوں نے ہمیں مدرسہ بھیجا اور ہمیں دینی درس اس لیے پڑھایا تاکہ ہم دینِ اسلام کے چراغ بن سکیں۔ یہ بات بالکل بجا ہے کہ ہم دین کے چراغ بنیں گے۔ مگر یہ لوگ دین کے چراغ بھیک سے جلاتے ہیں۔ ہمارے عوام اور عوام میں یہ لوگ جو خصوصاً عصری تعلیم کو زیور سمجھتے ہیں دین کا کام ہمارے گلے میں ڈالتے ہیں اور خود دنیا کے مزے لوٹتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ دین و دنیا دونوں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ خود کیلئے دنیا کی تمام آسائش حاصل کرنے کیلئے سکول، کالج، اور اُس میں ہر چیز کی سہولت۔ اس کے بعد ہر جگہ نوکری انہی کی ہیں۔ حکومت چلانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ہر چیز پر اپنی اجارہ داری قائم کی ہے۔ یہ اپنے گھروں میں اپنی ماؤں، بہنوں اور بیویوں کے ساتھ پیٹ بھر کھانا کھاتے ہیں اور دین کی ذمہ داری ہمیں سونپی ہے۔ ہمیں جو کہ کبھی بھی پیٹ بھر کر کھانا تک نہیں کھایا اور نہ ماں اور بہن کا پیار دیکھا ہے، گھر ہمارا حجرہ ہے اور خوراک ہماری دال اور آلو۔ اس کے باوجود ان کی قہر زدہ نظر ہم پر ہوتی ہے۔ ایسا جیسے کہ ہم ان میں سے نہیں کہیں اور سے آئے ہیں۔ کوئی دوسری مخلوق ہیں۔ ایسی مخلوق جس کا نہ تو پیٹ ہے اور نہ ہی نفس۔ آج وہ دن

آگیا ہے جس میں ہم انہیں بتائیں گے کہ ہم اپنے سر کے بدلے نظام حکومت اُن سے اچھی طرح چلا سکتے ہیں۔ اور یہ نظام ہم اپنی خوشی کیلئے نہیں بلکہ دین اسلام کی سر بلندی کیلئے چلائینگے۔ اور ہر اُس چیز کو اکھاڑ پھینکیں گے جو دین اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہو۔ چاہے وہ اپنے ہوں یا پر ائے۔ اس دنیا کی خوشیاں نہ ہماری ہیں اور نہ رہیں گی۔ اس دنیا کی زندگی فانی ہے۔ تو چاہیے کہ اس فانی زندگی کو ابدی زندگی پر قربان کر دیں۔ ہماری یہ قربانی اسلام کی سر بلندی کا باعث بن جائے گی۔ اللہ ہماری یہ قربانی اپنے در پہ قبول فرمائے۔ آمین

نعرہ تکبیر! اللہ اکبر

طالبان نے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

عبدالولی نے اس تقریر کے بعد تقریباً ایک گھنٹہ طالبان کے ساتھ گزارا، پھر اپنی گاڑی

میں بیٹھ کر اپنے نئی اوطاق پر چلا گیا۔

(۱۰)

اگرچہ ضلع میں پہلے بھی امن و امان کی صورت حال اچھی تھی۔ چوری، لوٹ مار بہت کم تھی مگر عبدالولی کے آنے سے یہ چیز بالکل ختم ہو گئی۔ عبدالولی کا دبدبہ تمام لوگوں پر طاری تھا۔ عبدالولی عوام الناس میں حافظ کے نام سے مشہور تھا۔ اب علاقے میں کسی کو جرات تک نہیں تھی کہ وہ کسی بڑے کام کا سوچ بھی سکے۔ اس لیے کہ حافظ صاحب لوگوں کے ذہنوں پر قابض تھا۔ حمام تو پہلے سے ہی بہت کم تھے، اب تو بالکل ختم ہو گئے تھے۔ جو تھے وہ صرف نہانے اور یا پھر بال بنوانے کیلئے تھے۔ اگر سونا بھی چلتی راہ میں رکھتے تو کسی کی مجال نہ ہوتی کہ اُسے ہاتھ تک لگائے۔ نماز کے وقت بہت سی ایسی دکانیں تھیں جو کھلی رہتیں۔ دکاندار ضرور نماز باجماعت ادا کرتے۔ کھلی دکان کی طرف کسی کو آنکھ اٹھانے کی جرات نہ تھی۔ عورتوں پر ایسا عب دبدبہ تھا کہ وہ کسی قیمت پر گھر سے نہیں نکلتیں۔ یہ رعب اور دبدبہ اُس دن اور بڑھ گیا جس دن عبدالولی اپنی گاڑی میں گشت پر نکلا تھا۔ اللہ داد بھی اُس کے ساتھ تھا۔ چار عورتوں کو دیکھا جو بازار میں پھر رہیں تھیں۔ اُس نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور ایک طالب سے کہا۔

جاؤ اُس دکاندار سے پوچھو کہ ان عورتوں کو کیوں دکان میں کھڑا کیا ہے۔

طالب گیا دکاندار سے عورتوں کے بارے میں پوچھا، دکاندار نے جب عبدالولی کو دیکھا

تو اُس کے پاس آیا۔

السلام علیکم

حافظ صاحب! یہ عورتیں سودا لینے کیلئے آئی ہیں۔ سودا خرید رہی ہیں۔

کیوں گھر میں کوئی اور نہیں جو یہ خود سودا لینے آئی ہیں۔ عبدالولی نے پوچھا۔

حافظ صاحب! اور تو مجھے بھی معلوم نہیں کہ گھر میں ہو گا کہ نہیں۔ میں تو

صرف-----

جاؤ، جاؤ عورتوں کو میرے پاس بھیجو۔ عبدالولی نے دکاندار کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

دکاندار بھاگ کر اپنی دکان کی طرف گیا اور عورتوں کو عبد الولی کی طرف بھیج دیا۔ عورتوں نے جب حافظ صاحب کا نام سنا تو کانپنے لگیں، اس لیے کہ انہوں نے حافظ صاحب کے بارے میں سنا تھا۔ ڈرتے ڈرتے عبد الولی کے پاس آئیں۔

تم لوگ کس لیے بازار آئی ہو؟ تم لوگوں کو پتہ نہیں کہ عورتوں کا گھر سے نکلنا ممنوع ہے۔ عبد الولی نے غصے سے کہا۔

بیٹا کیا کریں، گھر میں اتنا کوئی نہیں کہ سودا لاسکے۔ ایک بوڑھی عورت جس نے برقعہ میں اپنے آپ کو ڈھانپا تھا نے کہا۔

کیوں؟ کوئی بلا کھاگئی جو کوئی نہیں ہے۔ عبد الولی نے پوچھا۔

اس ملک کو جس بلا نے کھایا ہے اُس نے۔ بوڑھی عورت نے جواب دیا۔

ملک کو کس بلا نے کھایا ہے؟ عبد الولی کو بوڑھی عورت کا جواب ناخوش گوار گزرا۔ اسی لیے کچھ اور اونچی آواز میں کہا۔

تین بقیہ عورتیں ڈرتی ہوئی ایک دوسرے کے قریب ہو رہی تھیں۔

جنگ کی بلا نے کھایا ہے۔ پچھلے تیس سالوں سے یہ بلا اس ملک پر مسلط ہے۔ کسی کا باپ، کسی کا بیٹا تو کسی کا خاندان۔ ایسا گھر نہیں ہو گا جسے اس بلا نے نہ کھایا ہو۔ ہر گھر سے جنازے نکلے ہیں۔ بوڑھی عورت نے تخیل سے جواب دیا۔

اب تو جنگ نہیں ہے پھر تمہیں تو چاہیے کہ اکیلی آتی۔ ان تینوں کو کیوں ساتھ میں لائی ہو۔ عبد الولی نے دوسری عورتوں کی طرف دیکھا۔

ایک میری بہو ہے، دوسری میری ہمسائی ہے ان کے بھی گھر میں کوئی نہیں۔ بوڑھی عورت نے کہا۔

عبد الولی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ان عورتوں میں سے ایک کے ہاتھ سے سامان کی گٹھڑی گر گئی۔ جب وہ سامان کیلئے جھکی تو اُس کے ہاتھ نظر آئے جس پر مہندی لگی ہوئی تھی۔

اچھا تو تمہارے گھروں میں کوئی نہیں، ہاں۔ ہاتھ تو مہندی سے ایسے سرخ کیے ہیں جیسے دلہنیں۔ یہ ہاتھ کس کے لیے سرخ کیے ہیں۔ کچھ دُورے لگاؤ ان کو کہ پھر بازار کا نام بھی نہ لیں۔ یہ تو خود آئی کہ آئی اپنے ساتھ جو ان بہو کو بھی ہاتھوں میں مہندی لگی ساتھ لائی ہے۔ عبدالولی نے ایک طالب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

بیٹا میری بات سنو۔ بوڑھی عورت کچھ کہنے والی تھی کہ طالب نے عورتوں کو دُورے مارنا شروع کیے۔ عورتیں چیخنے لگیں۔ سارا بازار انہیں دیکھ رہا تھا مگر کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ انہیں اس کام سے روکیں۔

اللہ داد جلدی سے گاڑی سے اتر اور طالب سے کہا۔ بس کرو، کیا کر رہے ہو، جیسا کہ تم نے اسے زنا کاری میں پکڑا ہے۔ بوڑھی جوڑ میں پر گر گئی تھی اُسے اُٹھالیا۔
جاؤ اما! آئندہ خیال رکھنا۔ اللہ داد نے اُس سے کہا۔
خدا تم لوگوں کو غرق کرے۔ ایسی مسلمانی پر خدا تم لوگوں کی بادشاہت ختم کرے۔
بوڑھی عورت بد دعائیں دینے لگی۔

عبدالولی نے غصے سے گاڑی کا دروازہ کھولا تو اللہ داد نے جلدی سے واپس بند کر دیا۔
تم بیٹھے رہو اور گاڑی سے مت اُترو۔ اللہ داد نے عبدالولی سے کہا۔
پھر عورتوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ پھر عبدالولی سے کہا۔
یہ تم نے کیا کیا، ان عورتوں کا ایسا کونسا گناہ تھا جو سر بازار بے عزت کیا۔
یہ کیا کم گناہ ہے کہ وہ بازار آئی ہیں۔ پھر اکیلی بھی نہیں اپنے ساتھ جو ان سرخ ہاتھوں والی آئی ہے۔ تم نے اُس کی بد دعائیں نہیں سنیں؟ عبدالولی نے غصے سے کہا۔
عبدالولی اخوند! تم غصہ مت ہو۔ تمہارے خیال میں یہ عورتیں سودا کی بجائے دوسرے کام کے سلسلے میں آئیں تھیں۔ اللہ داد نے عبدالولی سے کہا۔

جس چیز کیلئے آئیں ہیں بازار آنا ان کیلئے جائز نہیں۔ عورت گھر میں رہے گی، گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ عبد الوالی نے کہا۔

اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا یا پھر ہم نہیں دیتے؟ اسلام کا نام بدنام مت کرو۔ اسلام کے نام پر اپنی مرضی مت چلاؤ۔ تم کی ان کی ضروریات سے کہاں واقف ہو کہ کس ضرورت کے تحت وہ باہر نکلی ہیں، ان کے گھروں کے حالات تمہیں معلوم ہیں کہ نہیں۔ اللہ داد نے جذباتی ہو کر کہا۔

تمہیں ان کے حالات کا پتہ ہے کہ ان بے کسوں پر کیا گزری ہے مجھ سے پوچھو۔

مجھے ان کے گھروں سے کیا کام۔ عبد الوالی نے کہا۔

جب گھروں کے حالات کی پرواہ نہیں تو پھر ان کے کاموں کی کیوں؟ اللہ داد اسی طرح جذباتی تھا۔

یہ میری ڈیوٹی ہے کہ ان کو برے کاموں سے روکو۔ عبد الوالی نے اللہ داد کی باتوں کو بغیر توجہ دیے کہا۔

انہوں نے ایسا کونسا بڑا کام کیا ہے، ماحول کی خرابی کا باعث بنا ہے، یا پھر بازار میں فحاشی پھیلار کھی ہے۔ پاؤں کے ناخن تک انہوں نے اپنے آپ کو ڈھانپ رکھا ہے۔ اللہ داد نے کہا۔
اللہ داد اخوند! تم تو جذباتی ہو گئے۔ یہ ڈنڈے کے مسلمان ہیں، یہ جب ڈنڈا دیکھتے ہیں تو پھر صحیح ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ عبد الوالی نے اللہ داد کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

یہی تو ہماری بد قسمتی ہے۔ اس عوام کی بد قسمتی ہے۔ جسے ہر کوئی ڈنڈے سے ہانکنا چاہتا ہے۔ انہیں حیوان سمجھتے ہیں اگر حیوان کے ساتھ بھی پیار سے پیش آیا جائے تو اس کا جواب بھی پیار ہوتا ہے۔ ہم تو پھر بھی انسان ہیں۔ دل کی بجائے ہم سروں پر بادشاہت قائم کرنا چاہتے ہیں۔
اللہ داد نے چند فقروں میں اپنے ملک اور عوام کی کیفیت بیان کر دی۔

بجائے اس کے کہ ہم ان لوگوں کی ضروریات زندگی کو پورا کریں، ہم انہیں ڈنڈوں سے خوف زدہ کر رہے ہیں اور خوف کے تابع بنا رہے ہیں۔ اللہ داد نے اپنی بات پوری کی۔
تم چلو خدا خیر کرے گا۔ عبد الولی نے کہا۔

اس واقع کے بعد عورتیں مرجا تیں مگر بازار نہیں آتیں۔ تمام علاقے کی عورتیں ایسی تھیں جیسے کہ قید خانے میں ہوں۔ ایسا نہ تھا کہ اس سے پہلے عورتیں بازار میں نہیں پھرتیں یا پھر بغیر منہ چھپائے پھرتیں، عورتیں اگر نکلتی بھی تو برقعہ اوڑھتیں یا بڑی چادر نماز اوڑھتیں۔ جس سے ان کا پورا جسم ڈھکا ہوتا۔ شہر کے لوگ ایسے تھے جیسے وہ اپنی مرضی کی زندگی نہیں گزار رہے بلکہ زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ نہ کوئی کھلے دل خوشی مناسکتا تھا نہ غم۔ عبد الولی کا خوف پورے علاقے میں پھیل چکا تھا۔ عبد الولی کے متعلق یہ مشہور تھا کہ وہ پتھر سے بنا ہے۔ نہ اُس کے سینے میں دل ہے اور نہ ہی رحم۔ ضلعی پولیس میں جس کسی نے جرم کیا ہوتا اور وہ نہیں مانتا تو حافظ صاحب کے نام نسخہ آرمایا جاتا۔ تمام علاقے سے جرم ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ عبد الولی کو یہ تمام باتیں ذہنی سکون مہیا کرتیں۔ کسی کو تکلیف دینا اُس کے ذہنی سکون کا حصہ بن چکا تھا۔ اس عمل پر وہ فخر محسوس کرتا۔ ظلم اور انصاف کے درمیان فرق کرنا اس رویے نے ختم کر دیا تھا۔ مگر جب اکیلا ہوتا تو دل بے چین ہو جاتا جیسے اُس کی کوئی خاص چیز کھو گئی ہو۔ ایک ایسی چیز جسے اُس کی طلب ہو۔ مگر وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ وہ کیا چیز ہے جسے اُس کی طلب ہے۔ اندر ایک خلا جیسا تھا۔ عبد الولی نے کبھی بھی کسی کو اپنے دل کا حال نہیں بتایا تھا۔ اس لیے اُس کے دل کے قریب کوئی تھا ہی نہیں۔ ایک اللہ داد اُس کا ایسا دوست تھا جس سے اُس نے تھوڑا بہت دل کا حال کہا تھا۔ مگر اللہ داد کو بھی اس کے دل کے اس حال کی کوئی خبر نہ تھی۔ کیسے پتہ چلتا، عبد الولی کو خود شعوری طور پر اس چیز کا ادراک نہ تھا۔ عبد الولی پر جب بھی بے سکونی کا دورہ پڑتا تو وہ اکیلا اپنے کمرے میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک چکر لگاتا۔ یا پھر شہر کے قریب اُس آبشار پر جاتا جہاں پانی بڑی تیزی سے اُوپر سے نیچے کی طرف آتا۔ اس پانی کا شور بہت زیادہ تھا۔ چھینٹے نزدیک

تک گرتے۔ عبد الولی اس پانی کے اتنے قریب بیٹھ جاتا کہ اُس کے چھینٹے عبد الولی کو بھگودیتے۔ ایسا لگتا جیسے اس پانی کے ذریعے وہ اپنے اندر کی بے سکونی کی آگ کو بجھانا چاہتا ہو۔ وہ آگ جو بچپن میں محرومی کی وجہ سے معاشرے نے اُس کے اندر لگائی تھی۔ عبد الولی اُس وقت اپنی ماں سے بہت پیار کرتا تھا۔ چھوٹی بہن گل پانزا تو اُس کے جگر کا ٹکڑا تھی۔ اُس محبت سے وہ اُس وقت محروم ہوا اور یہ محبت ادھوری رہ گئی۔ جب وہ گھر سے مسجد پڑھنے کیلئے نکلا، مہینے کے بعد جب وہ جمعرات کو گھر آتا تو گل پانزا کو اُس وقت تک گود میں اٹھائے رکھتا جب تک وہ واپس نہ چلا جاتا۔ یا پھر ماں کی گود میں سر رکھتا۔ ماں کے ساتھ میٹھی میٹھی باتیں کرتا، ماں اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی۔ اسے یہ بہت اچھا لگتا جب اُس کی ماں اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی۔ اُس کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ مسجد میں زیادہ دن گزارے۔ پڑھنے کو بہت دل چاہتا مگر ماں کے بغیر اور ماں سے دور دن گزارنا اس کیلئے مشکل تھا۔ جمعہ کی شب یا پھر ہفتے کے دن جب وہ گھر سے نکلتا تو اُس کی آنکھوں میں آنسو بہنے لگتے۔ ماں بھی جب اُس کا ماتھا چومتی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ پھر عبد الولی سے چھپا کر اپنے دوپٹے کے پلو سے پونچھ لیتی اور اُسے کہتی

جا بیٹا! اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔

یہ بات وہ اتنا بے بس ہو کر کہتی جیسے اُس سے اُس کا بیٹا زبردستی چھینا جا رہا ہو اور وہ اُسے نہیں روک سکتی۔

اُس دن جب وہ آخری بار اپنے گھر سے نکل رہا تھا تو گل پانزا کا اُس کو دامن سے پکڑنا اسی طرح یاد تھا جیسے آج بھی اُس نے اسے دامن سے پکڑا ہو۔ ماں کی بے بسی کے آنسو آج بھی اُس کے دل پر چھریاں چلا رہے تھے۔ وقت کے دیے ہوئے ان زخموں نے عبد الولی کے وجود اور شخصیت کے بیچ ایسی خلا بنائی تھی جس کی وجہ سے اُس کی زندگی پر ایک خوف کا سایہ پھیل گیا تھا۔ عبد الولی کی شخصیت ایک عام شخصیت نہ تھی۔ اسی لیے وہ لاشعوری طور پر اپنی محرومیوں کا بدلہ اس معاشرے اور عوام سے لے رہا تھا۔

(۱۱)

آج خال دارہ کو عبد الولی بہت یاد آ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ جیسے کسی نے آنسوؤں کی تمام راہیں کھول دیں ہوں۔ احمد خان جس نے اب گھر کی ذمہ داری سنبھال لی تھی عبد الولی کے جانے کے بعد زندگی کو گزارنے کیلئے بھرپور کاندھا دیا تھا۔ اگرچہ وہ عبد الولی سے ایک سال چھوٹا تھا مگر اُس کی جسمانی ساخت ایسی بن گئی تھی کہ وہ عبد الولی کا ہم عمر لگ رہا تھا۔ مشقت نے احمد خان کے چہرے سے جوانی کی شگفتگی مٹا دی تھی۔ گھر کی تمام ضروریات بڑی ذمہ داری کے ساتھ پوری کرتا۔ ماں اور بہنوں کا بہت خیال رکھ رہا تھا۔ ایک بہن کو بیاہ چکا تھا۔ اور دوسرے بھائی کی شادی کراچکا تھا۔

ماں کو جب روتے ہوئے دیکھا تو اُس کے پاس آیا۔

ماں! کیوں رورہی ہو؟ کیا ہوا ہے؟

رونا تو اب میری قسمت میں لکھا ہے۔ ماں نے جواب دیا۔

کیوں ہم آپ کے بیٹے نہیں؟ ہم نے آپ کی بات نہیں مانی؟ تینوں آپ کی خدمت میں ایسے کھڑے ہیں جیسے نوکر۔ احمد خان نے ماں کے آنسوؤں میں عبد الولی کی تصویر دیکھ لی۔ اس لیے یہ سب کہا۔

خدا تم لوگوں کو سدا آباد رکھے۔ میں اس لیے نہیں رورہی کہ میری خدمت نہیں ہو رہی۔ دونوں بہوئیں میری بہت خیال رکھ رہی ہیں۔ مگر بیٹا۔۔۔۔۔۔ خالدارہ کی آواز وہیں اُس کے گلے میں رُک گئی جیسے کسی نے اُس کا راستہ روکا ہو۔

میں سمجھتا ہوں ماں! مگر کیا کروں، میرے بس میں نہیں۔ احمد خان نے اپنی بات پوری

نہ کی۔

ہاں بیٹا! اس لیے تو خدا کے سامنے رورہی ہوں کہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ افسوس اس بات کا بھی ہے کہ وہ کتنا ظالم ہے، ایسا گیا جیسے کسی اور کا بیٹا ہو۔

کیوں ماں! کیا میں اُس کا بڑا بھائی نہیں، کیا یہ دوسرے اُس کے بھائی نہیں۔ اگر طالب نہ ہوا تو کیا گل پانزا کی مانگ نہیں نکلے گی؟ مریم کی مانگ بھی تو میں نے نکالی تھی۔ احمد خان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

گل پانزا کی بات اور ہے۔ گل پانزا کو میں نے دیکھا ہے جب بھی وہ اپنے بستر پر لیٹی ہے تو پہلے اپنے آنسوؤں سے تکیہ گیلا کر لیتی ہے۔ جب سے اُس نے اپنے جینز کیلئے کشیدہ کاری شروع کی ہے تب سے ایک ایک کمر بند طالب کیلئے بنا رہی ہے۔ اب تک دس کمر بند بنا چکی ہے۔ ماں نے جواب دیا۔

عبدالولی پورے گھر کے لیے ایک زخم جیسا تھا۔ مگر ماں کیلئے یہ زخم ناسور بن چکا تھا جس کا علاج کسی کے پاس نہ تھا۔ ہر خوشی کے موقع پر یہ زخم پھر سے پھوٹ پڑتے۔ تمام گھر کو خوشی کی بجائے غم کا سامنا کرنا پڑتا۔ جب عبدالولی اپنے گھر سے روانہ ہو رہا تھا تو اُس وقت گل پانزا لگ بھگ چار برس کی تھی۔ اپنے چھوٹے سے ذہن کے مطابق ماں کی باتوں نے پورا پورا رنگ بھرا تھا۔ جس سے ایک جوان عبدالولی بن چکا تھا۔ گل پانزا کو یہ بات اور بھی ٹھیس پہنچاتی کہ عبدالولی گل پانزا سے بہت پیار کرتا تھا۔ گل پانزا نے اپنے ذہن کے کیڑوس پر عبدالولی ایک تصویر بنا رکھی تھی۔ اگرچہ گل پانزا سے دوسرے بھائی بھی بہت پیار کرتے تھے مگر عبدالولی کے بچپن کا پیار کسی نے حاصل نہ کیا۔

گل پانزا کی شادی کی تیاریاں جاری تھی۔ بھائیوں نے اپنی بہن کی خوشی کیلئے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مگر ایک ایسی خوشی تھی جو اُن کے بس میں نہ تھی۔ اور وہ تھی عبدالولی کا پیار۔

شادی کے دن جب ہمجھولیوں نے اُس کے ہاتھوں پر مہندی لگائی، سر پر سبز رنگ کا دوپٹہ ڈالا اور بال بنانے کیلئے گاؤں کی ایک بوڑھی عورت بھی آئی تھی۔ گل پانزا کے بال بنانے کیلئے سر سے دوپٹہ اتارا گیا اور مریم سے کہا

دلہن کے بڑے بھائی کو بلاؤ تاکہ دلہن کے سر کی مانگ نکالے۔ بیچ میں راستہ نکالے۔

بوڑھی عورت کی یہ بات گل پانزا پر ایسے گری جیسے بجلی۔ گل پانزا چچھڑی جیسے جنات نے آگھیرا ہو۔

ہائے طالب۔۔۔۔۔ ہائے طالب۔۔۔۔۔ میرا پیارا لالا کہاں ہے۔ گل پانزا نے بوڑھی عورت کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ میرے پیارے لالا کو بلا لاؤ، آج اُس کی بہن گھر سے جا رہی ہے۔۔۔۔۔ ہائے لالا۔۔۔۔۔ ہائے لالا۔۔۔۔۔ آپ کدھر ہو۔۔۔۔۔ میں کیا کروں۔۔۔۔۔ میری مانگ کون نکالے گا۔۔۔۔۔ طالب لالا تو نہیں۔۔۔۔۔ گل پانزا زارو قطار رونے لگی۔ سہلیاں اور گاؤں سے آئی ہوئی عورتیں بوکھلا گئیں۔ جیسے وہاں کسی نے سانپ چھوڑ دیا ہو۔ سر کے بال بناتے وقت ہر دلہن روتی ہے مگر گل پانزا کا رونا کچھ اور تھا۔ ایک بہن کے ارمانوں کا رونا۔ شاید اس رونے کو گل پانزا نے اپنے دل میں کئی برسوں سے جگہ دی ہو۔ لیکن آج، آج وہ بند ٹوٹ گئے۔ رونا اُس کے دل سے ہو کر زبان پر آگیا۔ اسی لیے بیٹھی عورتیں بوکھلا گئیں کہ کیا کریں۔ اسی اثناء احمد خان کسی کام سے گھر کے صحن میں آیا تھا، اُس نے گل پانزا کو گلے سے لگایا۔

مت رو، کیوں رو رہی ہو، جس بہن کے جوان بھائی ہوں کیا وہ ایسے روتی ہیں؟

ہائے لالا۔۔۔۔۔ طالب لالا نہیں ہے۔۔۔۔۔ میری مانگ کون نکالے گا۔۔۔۔۔ مجھے گلے سے کون لگائے گا۔۔۔۔۔ کون مجھے اٹھائے گا۔۔۔۔۔ گل پانزا اسی طرح زارو قطار رو رہی تھی۔

تمھاری مانگ میں نکالوں گا۔۔۔۔۔ تمھارا بھائی۔۔۔۔۔ میں تمھیں اٹھاؤنگا۔۔۔۔۔ تم کیوں رو رہی ہو۔۔۔۔۔ کیا ہوا جو طالب نہیں ہے۔۔۔۔۔ دوسرے تو ہیں۔ بس کرو۔ بس کرو۔ لالا تمھارا ہر ارمان پورا کرے گا۔ احمد خان کی آواز بیٹھ گئی۔

صحن میں بیٹھی تمام عورتوں کے آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ گھر میں ایسا ماحول بن گیا جیسے گل پانزا کی ڈولی کی بجائے عبدالولی کا جنازہ اٹھایا جا رہا ہو۔ ماں تو ایک زندہ لاش بن چکی تھی۔

(۱۲)

آج صبح سے عبد الولی بے سکون تھا جیسے اُس کی کوئی چیز کھو گئی ہو۔ صبح ناشتہ بھی نہیں کیا۔ اذواق میں جب دوسرے طالبان نے ناشتہ کیا تو ایک طالب عبد الولی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

حافظ صاحب! گاڑی گشت کیلئے تیار ہے۔

عبد الولی کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ گشت پر نکلے۔ اُس نے طالب سے کہا

ایسا کرو کہ اللہ داد اخوند سے کہو کہ آج گشت کر لے۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔

طالب بھی باہر نکل گیا۔ کچھ دیر بعد اللہ داد عبد الولی کے کمرے میں داخل ہوا

السلام علیکم!

وعلیکم سلام! عبد الولی نے جواب دیا۔

خیر تو ہے آج گشت پر کیوں نہیں نکل رہے۔ اللہ داد نے عبد الولی سے پوچھا۔

اللہ داد اخوند! پتہ نہیں کیوں آج طبیعت میں بے سکونی زیادہ ہے۔ عبد الولی نے جواب

دیا۔

کیوں رات کے آلو کے شور بے نے تو اثر نہیں کیا۔ اللہ داد نے مذاق میں کہا۔

اللہ داد اخوند! ہمارے پیٹ اس کے عادی ہیں۔ عبد الولی نے مسکرا کر کہا۔

ہمارے پیٹ اس سے خراب نہیں ہوتے ہاں اگر مرغن کھانا کھایا ہو تو شاید خراب

ہو جاتے ہیں۔ ہماری قسمت میں نہ کل اچھا کھانا تھا اور نہ آج۔ سب کچھ ہمارے ہاتھوں میں ہونے کے

باوجود۔ عبد الولی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

شہر میں ہر چیز ہے، تمہارا ہاتھ کس نے روکا ہے۔ ہر دکاندار اس بات پر خوش ہو گا کہ وہ

تمہاری خدمت کرے۔ اللہ داد نے کہا۔

کچھ تو اپنی داڑھی کی شرم کرو۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ دنیا کیا کہے گی۔ بہت اچھا لگوں گا جو

دکانداروں سے مفت چیزیں لوں گا۔ یہ خدا کو پسند ہو گا۔ عبد الولی نے کہا۔

خدا تو بہت سی چیزوں کو ناپسند کرتا ہے مگر وہ ہم کرتے ہیں۔ پھر دنیا کے بارے میں مجھے اور تمہیں کیا فکر۔ ہم نے کبھی دنیا کے بارے سوچا ہے۔ دنیا تو ویسے بھی ہم پر غصہ ہے۔ اللہ داد نے طنزیہ انداز میں کہا۔

اللہ داد اخوند! تم مست ہو۔ تم جاؤ میں آج بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔ تم ابھی جا کر گشت کرو میں پھر سہ پہر کو تمہارے ساتھ گشت پر نکلتا ہوں۔ اور ہاں خیال کرنا ایسا کوئی کام نہ کرنا جس کا میں پھر جواب نہ دے سکوں۔ پچھلی بار بھی تم نے گاڑی میں ٹیپ لگایا تھا۔ عبد الولی نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔

حافظ صاحب! قربان جاؤں آپ لوگوں کے نظام سے۔ لوگوں کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی مزے کی ہر چیز پر پابندی لگائی ہے۔ میرے دل کو تو رنگ لگ چکا ہے۔ اللہ داد نے جاتے جاتے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

مزہ۔ عبد الولی خود سے ہکلام ہوا۔ مزہ، میرا بس چلے تو اس مزہ لفظ کو کتاب سے نکال دوں۔ جس کسی نے ہماری زندگی سے مزے چھین لیے ہیں انہیں زندگی سے مزے نہیں دوں گا۔ عبد الولی نے ٹیک ایک طرف لگاتے ہوئے کہا۔

پھر واپس اٹھ بیٹھا، ارد گرد کمرے میں نظر دوڑائی، پھر اٹھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا، طالبان کے کاندھوں پر لٹکی کلاشنکوفوں کو دیکھا جو گشت کی گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ پھر ایک چھوٹے طالب پر نظر پڑی جو برتن دھو رہا تھا۔

یہ ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ آہستہ سے خود کلامی کی۔ جلدی سے وہ کھڑکی سے ایک طرف ہو کر نیچے بچھے ہوئے گدیلے پر آگرا جیسے کسی نے اُسے دھکا دیا ہو۔ اپنا بچپن اُسے یاد آیا۔ بچپن کے ساتھ ساتھ اپنا گھر یاد آیا۔ ماں نظروں کے سامنے آگئی۔ ایسے نظر آئی جیسے وہ بہت غمگین ہو۔ دونوں ہاتھ کھول کر اُسے اپنے طرف بلا رہی ہو۔ عبد الولی نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ بہت عرصے کے بعد وہ یادوں کی گود میں گھر گیا۔

طالب بیٹا! آج میں نے تمہارے لیے شور بہ بنایا ہے۔ بہت دن ہوئے تھے کہ ہم نے بھی گوشت نہیں کھایا تھا۔ تمہارے ابا سے کہا کہ آج عبد الولی آرہا ہے تھورا گوشت ضرور لانا۔ پتہ نہیں وہ مدرسہ میں کچھ کھاتا بھی ہے یا نہیں۔ تمہیں تو شور بہ بہت پسند ہے۔ ماں نے اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

مدرسہ میں گوشت کہاں ہے۔ وہاں تو دال ہے یا پھر آلو۔ جب میں گاؤں میں وظیفہ کھٹے کرتا ہوں تو مجھے شور بہ کی خوشبو بہت اچھی لگتی۔ دل چاہتا ہے پوری دیگ پڑالوں۔ عبد الولی نے اپنی ماں سے کہا۔

ہو۔ تم اب بھی وظیفہ کھٹے کرتے ہو؟ تم تو کہہ رہے تھے کہ مدرسہ میں وظیفہ کھٹے نہیں کیے جاتے۔ ماں نے پوچھا۔

کیوں مدرسہ کے طالبان پھر کیا کھاتے ہیں؟ اسی وظیفوں پر تو گزارا ہے اُن کا۔ یہ کون سے بڑے مدارس ہیں جو چندہ جمع کرتے ہیں۔ اپنے باورچی ہوتے ہیں جو اُن کیلئے کھانا بناتے ہیں۔

پھر تم لوگوں کیلئے کھانا کون پکاتا ہے؟ ماں نے پوچھا۔

طالبان خود پکاتے ہیں۔ ایک بار ایک طالب۔ دوسری بار دوسرا طالب۔ وہ مجھ سے تھوڑے بڑے ہیں۔ میرے جیسے چھوٹے طالبان صرف وظیفہ (روٹی) کھٹے کرتے ہیں اور بڑے سالن پکاتے ہیں۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

پھر تو یہ کیسا سالن ہو گا۔ ایک کھچڑی سی ہوتی ہو گی۔ ماں نے کہا۔

آپ کیا سمجھیں سمجھیں ہوئے ہونگے، پانی میں آلو ایسے ہوتے ہیں جیسے نہر میں پتھر۔

دونوں ہنس پڑے۔

ماں! میرا دل نہیں چاہتا کہ میں وہاں راتوں کو رہوں۔ مجھے گھر کی بہت یاد آتی ہے۔ آپ، گل پانزا اور تمام بہت یاد آتے ہیں۔ میں اپنے گھر میں آپ کے قریب سونا چاہتا ہوں۔ میں وہاں بہت

ڈرتا ہوں۔ حجرے میں ہم اتنی تنگ جگہ پر سوتے ہیں کہ کسی کا سر تو کسی کے پاؤں۔ گل پائز تو بہت یاد آتی ہے۔

گل پائز کے نام پر عبد الولیٰ ایک دم چونک اٹھا۔ یادوں کی دنیا سے حقیقت کی طرف آ گیا۔ گل پائز اب بہت بڑی ہو گئی ہو گی۔ اب تو میں بھی اُسے نہیں پہچان سکوں گا۔ عبد الولیٰ اپنی جگہ سے اٹھا۔ چادر اپنے گرد لپیٹی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ صاف پانی کی ندی کی طرف روانہ ہوا۔ آج اُسے اپنا آپ تہا تہا سا محسوس ہو رہا تھا اور کچھ بے بس بھی۔

اللہ داد جب واپس گشت سے اپنی اوطاق پر آیا تو سیدھا عبد الولیٰ کے کمرے میں چلا گیا مگر وہاں عبد الولیٰ موجود نہ تھا۔ چھوٹے طالب سے جب عبد الولیٰ کے بارے میں پوچھا تو اُس نے کہا۔
تھوڑی دیر ہوئی ہے کہ باہر چلا گیا۔

اللہ داد واپس گشت کی گاڑی میں بیٹھ کر اُسے سٹارٹ کیا، دوسرے طالبان نے جلدی جلدی کلا شکوف اٹھائے تو اللہ داد نے اُن سے کہا۔
تم لوگ یہی رکو، میں واپس آتا ہوں۔

اللہ داد کو معلوم تھا کہ عبد الولیٰ کہاں ہو گا۔ سیدھانندی کی اُس جگہ پر گیا جہاں پانی آبشار کی شکل میں گرتا تھا۔ عبد الولیٰ پانی کے بہت قریب بیٹھا تھا جس سے اُس کے کپڑے گیلے ہو چکے تھے۔
اللہ داد نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی اور خود گاڑی سے اتر کر عبد الولیٰ کے قریب آ کر اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ عبد الولیٰ نے جلدی سے اُس کی طرف دیکھا۔ آنکھیں ایسی سُرخ تھیں جیسے مرچی ڈالی گئی ہو۔ اللہ داد نے جب اپنے دوست کی آنکھوں کو دیکھا تو اُس نے اپنے دل میں ایک درد سا محسوس کیا۔

عبد الولیٰ خونند! یہ کیا؟ تمہاری آنکھیں اتنی سُرخ کیوں ہیں۔ رو رہے تھے۔ اللہ داد نے حیرانی سے پوچھا۔

عبد الولیٰ نے جلدی جلدی منہ پر پانی پھینکا اور آنکھوں کو دھو ڈالا۔

اللہ داد اخوند! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ عبد الولی نے ایسے انداز میں کہا کہ جیسے کسی نے اس کی چوری پکڑی ہو۔

میں تو تمہارے پیچھے یہاں آیا ہوں۔ تم میری بات کا جواب دو کہ تمہاری آنکھیں اتنی سُرخ کیوں ہیں۔ اللہ داد نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

کچھ نہیں۔ بس ایسے ہی کچھ ڈکھ رہی ہیں۔ عبد الولی نے اپنا چہرہ دوسری طرف کیا۔ جھوٹ مت بولو حافظ! تمہارے مُنہ سے جھوٹ اچھا نہیں لگتا۔ صبح تو ٹھیک تھیں اب کیا ہوا۔ کم از کم مجھ سے تو جھوٹ مت بولو۔ مجھے صبح ہی سے کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کچھ پریشان ہو۔ میں تمہارا درد سمجھتا ہوں، کتنی بار تم سے کہا ہے کہ ایک مرتبہ گھر جاؤ، ماں باپ بہن بھائیوں کو دیکھ آؤ۔ مگر تم کسی کی بات مانتے کب ہو۔ کتنے سال ہوئے ہیں جو تم گھر سے نکلے ہو۔ کتنی بار زخمی ہوئے، موت کے قریب پہنچے، علاج کیلئے پاکستان بھی گئے، مگر گھر نہیں گئے۔ معلوم نہیں کہ خود کو سزا دے رہے ہو یا پھر اپنوں کو۔ کس چیز کا بدلہ لے رہے ہو، نہ کوئی حال بھیجتے ہو نہ جاتے ہو، آخر کیوں؟ اللہ داد کی باتیں درد بھری تھیں۔

اللہ داد اخوند! مجھے سمجھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو اور کیا چاہتے ہو۔ عبد الولی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گاڑی کی طرف آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔ عبد الولی ایسے انداز میں جا رہا تھا جیسے کسی میدان جنگ میں سپاہی شکست کھا کر جا رہا ہو اور سب کچھ گنوا بیٹھا ہو۔

میں تم سے پشتو میں مخاطب ہوں عربی نہیں بول رہا جو تم نہیں سمجھ رہے۔ میری اور تمہاری دوستی کو عرصہ ہوا ہے۔ میں تمہارے ہر درد کو سمجھتا ہوں۔ میں تمہیں کہہ رہا ہوں کہ تم کچھ دنوں کیلئے گھر کیوں نہیں جاتے؟ اللہ داد نے پھر وہی بات کی۔ کس گھر کی بات کر رہے ہو اللہ داد اخوند! اُس گھر کی جس میں میرے لیے رات گزارنے کی جگہ نہ تھی۔ ایک پیٹ کیلئے مجھے مسجد میں پھینک دیا اور دوسروں کے ہاتھوں میں دے دیا گیا۔ میرے ارمانوں پر مٹی ڈالی گئی۔ اُس گھر کی بات کرتے ہو جس میں میری ماں اور بہن بے بس تھے۔ صرف رونے کا حق انہیں حاصل تھا۔ اور اگر

ابنوں کی بات کرتے ہو جو میرے چچا کے ٹکڑوں پر پلے بڑے ہیں۔ کس گھر کی بات کرتے ہو۔ عبد الولی کی برداشت کا مادہ پھٹ گیا۔ اس لیے جاؤں تاکہ چچیرے بھائی کی کڑوی باتیں سنوں، اُن کے طعنے سنوں۔ عبد الولی نے غصے میں کہا۔

عبد الولی اخوند! تم اب وہ پہلے والے عبد الولی نہیں رہے جو مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ تم اب ایک اسلامی ریاست کے ایک ضلع کی ایک خاص کرسی پر بیٹھے ہو۔ تم ایک خاص شخص ہو عام شخص نہیں۔ تم اب یہ کر سکتے ہو کہ گھر کے ساتھ ساتھ ابنوں کو بھی نفع پہنچاؤ، تمہاری بازوؤں میں طاقت ہے۔ اللہ دانے اُسے تسلی دی۔

نفع؟ کس نفع کی بات کر رہے ہو۔ اُس نفع کی بات کر رہے ہو جسے یہ لوگ نفع سمجھ رہے ہیں۔ جس دن سے میں اپنے گھر سے نکلا ہوں میں نے اپنے آپ سے یہ عہد کیا تھا کہ میں اپنے لیے کچھ نہیں کرونگا، جو کرونگا صرف خدا کیلئے کرونگا۔ اللہ داد اخوند! میں نے، میری ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ دنیا کا نفع اور مزہ اپنی نظر میں رکھوں۔ میری دسترس میں سب کچھ ہے۔ اچھی شادی، اچھا گھر، اچھی زندگی۔ مگر ان سب سے مجھے گھن آتی ہے۔ ایسی گھن جو دوسروں کے ہاتھوں میں بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

اللہ داد نے جب عبد الولی کی باتیں سنیں تو اُسے اچھی نہیں لگیں۔ اُسے ایسے لگا جیسے عبد الولی نے بدلے کی راہ اپنائی ہو، اس لیے خاموش ہوا۔

دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے اور اپنے اوطاق کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ دونوں اوطاق پر پہنچ گئے تو ضلعی امیر کی طرف سے پیغام آیا تھا کہ عبد الولی سے کہیں کہ وہ ضلع امیر سے ملیں۔ عبد الولی اور اللہ داد نے دوپہر کا کھانا کھایا، پھر ظہر کی نماز ادا کی اور پھر گاڑی میں سوار ہو کر ضلع امیر کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ عبد الولی کو ضلع امیر کے دفتر میں بڑے احسن طریقے سے خوش آمدید کہا گیا۔ حال احوال پوچھنے کے بعد ضلع امیر نے عبد الولی سے کہا۔

والی صاحب کی طرف سے پیغام آیا ہے۔ وہ مکہ (مدد) مانگ رہے ہیں۔

ماں اُس کا سر بھی اپنے بیٹے کی طرح اپنی گھود میں لے لیگی۔ عبد الولی کو چھوٹے بھائی کی طرح پیار کرتا۔ اُس کے ناز اٹھاتا، بُرے وقت میں خود کو آگے کرتا، اچھے وقت میں عبد الولی کو آگے کرتا۔ اس لیے وہ عوام کی نظروں میں اس طرح نظر آتے کہ عبد الولی بڑا اور اللہ داد چھوٹا ہے۔ عبد الولی نے بھی نا امیدی کے زخم کھائے تھے، مگر یہ ایسے زخم نہ تھے جن کا علاج نہ تھا۔ مگر اللہ داد کے حصے میں امید نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ ایک دوسرے کے غم میں شریک ان دونوں دوستوں کی دولت بس ایک دوسرے کا یہی ساتھ تھا۔ آج حالات نے اُسے بھی چھین لینے کیلئے آستین چڑھالیے تھے۔ عبد الولی کے ناچاہتے ہوئے بھی اللہ داد نے اپنے آپ کو علیحدہ ہونے کیلئے تیار کر لیا۔ اس لیے کہ مجبور تھا۔ ضلع امیر کے حکم کو ناماننا اسلامی مملکت کے قوانین نامانتا تھے۔

اللہ داد کو بیس طالبان کے ساتھ ضلع امیر کے دفتر کی طرف رخصت کیا۔ وہ خود اپنے اوطاق پر دیگر طالبان کے ساتھ رہ گیا۔ اللہ داد عبد الولی کے ساتھ ہر وقت شانہ بشانہ رہتا۔ اگر گشت پر نکلتا یا پھر دوسری طرف جانا ہوتا۔ اسی طرح عبد الولی کو اللہ داد کے بغیر زندگی گزارنا مشکل تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کسی نے اُس کا دایاں بازو کاٹ دیا ہو۔ اللہ داد کے بغیر عبد الولی نے اور سختی شروع کی۔ کسی سے کسی قسم کی رعایت برتنے کیلئے تیار نہ تھا اور نہ ایسا کوئی تھا کہ جو اسے ٹوکے یا روکے۔ کسی کی اتنی ہمت نہ تھی۔ یہ کام صرف اللہ داد کر سکتا تھا جو اب یہاں نہیں تھا۔

میری بات کا جواب دو۔ تمہارے گھر میں ٹی وی ہے یا نہیں؟ عبد الولی نے اور غصے سے

پوچھا۔

ہے مگر میں نے لگایا نہیں ہے۔ جو ان نے جواب دیا۔

تم نے نہیں لگایا؟ عبد الولی نے آنکھوں میں آنکھ ڈال کر پوچھا۔

جو ان نے نظریں جھکالیں۔ جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

خود نکالتے ہو یا میں طالبان کو اندر بھیجوں۔ عبد الولی نے کہا۔

حافظ صاحب نکالتا ہوں۔ جو ان یہ کہتے ہی اندر چلا گیا۔

ان کی باتوں پر اُس پاس کے کچھ لوگ گھروں سے باہر نکلے۔ عورتیں دروازوں کی

دراڑ سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد جو ان ایک چھوٹائی وی لیے آیا۔ عبد الولی کے

قدموں کے ساتھ نیچے زمین پر رکھ دیا۔

جاؤ وہ دوسری چیزیں بھی لے آؤ۔ عبد الولی نے کہا۔

کون سی چیزیں؟ جو ان انجان سا بنا۔

اس ٹی وی میں تم کیا دیکھتے ہو۔ جاؤ وی سی آر، سی ڈی، کیسٹ وغیرہ لے آؤ۔ عبد الولی

نے چیزوں کی نشاندہی کی۔

جو ان آہستہ سے گھر کے اندر گیا، تھوڑی دیر بعد ایک گھڑی ہاتھ میں لیے آیا جس میں

سی ڈی پلئیر اور سی ڈیز تھیں وہ بھی عبد الولی کے سامنے رکھ دیں۔

ٹیپ بھی ہے یا نہیں؟ عبد الولی نے پوچھا۔

نہیں، ٹیپ نہیں ہے۔ ایک ریڈیو گھر میں ہے۔ جو ان کے ماتھے پر پسینے چھوٹنے لگے۔

ملاغازی اخوند! زرا تمہارا کلا شکوف دینا۔ عبد الولی نے ایک طالب سے کہا۔

گلی میں کھڑے تمام لوگ پریشان تھے کہ اب کیا ہو گا۔ سب خاموش تھے اور کچھ

نہیں کر سکتے تھے۔

عبدالولی نے کلاشکوف کو اس کی نلی سے پکڑا اور ٹی وی کو توڑنے لگا۔ ٹی وی کی سکرین میں سران بن گیا۔ پھر ٹی وی کو اٹھا کر دیوار سے مارا۔ ٹی وی کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر سی ڈی پائیر کو دیوار سے مارا۔ عبدالولی پاگلوں کی طرح حرکتیں کرنے لگا۔ سی ڈیز کو پاؤں سے تھوڑ رہا تھا۔ عمامہ اُس کے سر سے گر کر گردن میں تھی۔ جوان شخص دیوار کے قریب جا کر عبدالولی کو حیرانی و پریشانی سے دیکھ رہا تھا۔ عبدالولی نے جب اُن چیزوں کا کام تمام کر دیا تو کلاشکوف جوان شخص کے سر پر رکھ کر کہا۔

اب پار کر دوں تمہارے سر سے گولی؟ عبدالولی نے کلاشکوف سے اُس کے سر کو دھکا دیا۔ جوان شخص کے ماتھے سے کلاشکوف کی وجہ سے خون بہنے لگا۔ وہ سخت حیران تھا۔ اُس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

مولوی غازی اخوند! یہ چیزیں چادر میں ڈال کر لے چلو اور تم بھی چلو۔ شاباش۔
عبدالولی نے جوان شخص کو لات مار کر کہا۔

جوان شخص کے گھر سے ایک عورت بغیر دوپٹے اوڑھے چیختی ہوئی نکلی۔
خدا کیلئے میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں، میرے خاوند کو چھوڑ دیں۔ عورت
عبدالولی کے پیروں میں گر گئی۔

عبدالولی نے جلدی سے اپنا چادر عورت پر پھینکا، اُس کا سر اور بدن اُس سے ڈھک گیا
مگر عورت نے عبدالولی کے پیر مضبوطی سے پکڑے تھے اور خدا کا واسطہ دے رہی تھی۔
عبدالولی اُسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا پیچھے ہٹنا چاہ رہا تھا لیکن عورت اُس کے پیروں
سے ایسے چپک گئی تھی جیسے کیل۔

عبدالولی نے جوان شخص سے کہا۔

یہاں آؤ، اپنی بیوی کو گھر لے جاؤ۔ پھر عورت سے کہا۔

بہن! میں تمہارے شوہر کو کچھ نہیں کہوں گا اگر تم یہاں سے اٹھ کر گھر نہیں گئی تو میں یہی اُسے گولی مار دوں گا۔ جوان شخص پر کلاشنکوف سیدھا کرتے ہوئے کہا۔
عبدالولی کی دھمکی نے کام کیا، عورت کھڑی ہو گئی اور جوان شخص نے اُسے ہاتھ سے پکڑ کر گھر کے اندر لے گیا۔

عبدالولی نے لوگوں کی طرف منہ کر کے کہا۔ یہ کوئی تماشہ کرنے کی جگہ نہیں، عبرت کی جگہ ہے۔ آپ لوگوں کو چاہیے کہ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں اور ان چیزوں سے اپنے آپ کو دور رکھیں۔ تم جاؤ اور تھوڑا ٹھنڈا پانی لے کر آؤ۔ عبدالولی نے ایک شخص جو کہ اپنے گھر کے دروازے کے ساتھ کھڑا تھا کو کہا۔

دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیں، دل میں ایک خوشگوار کیفیت کو محسوس کیا، اُسے ایسا لگا جیسے آج اُس نے اپنے چچا سے بدلہ لے لیا ہو۔ جس وقت عبدالولی بچہ تھا تو اُسے ٹی وی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اُس کے چچا کے گھر میں ٹی وی تھا اور اکثر وہاں جایا کرتا تھا۔ مگر وہ اُسے ٹی وی دیکھنے نہیں دیتے۔ عمو مادہ دروازے کے پیچھے کھڑا ہو کر ٹی وی کی آواز سنتا، گرچہ اُسے اُس کی تصویر دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اُسے ٹی وی دیکھنے نہیں دیتے مگر وہ پھر بھی ڈھیٹ بنا رہتا اور وہاں سے نہ جاتا۔ پھر وہ لوگ ٹی وی بند کر دیتے۔

جاؤ یہاں سے منحوس شکل کہیں کے۔۔۔ تمہاری وجہ سے تو۔۔۔۔۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ چچا اُسے غصے سے کہتا۔

عبدالولی کے دل میں کارٹون دیکھنے کی حسرت رہ جاتی۔ مایوس سادل لیے چچا کے گھر سے نکل جاتا۔ وہ اکثر مدرسہ میں یہ سوچتا کہ جب وہ بڑا ہو جائے گا تو سلیم کے گھر کا ٹی وی توڑ دے گا۔ گرچہ آج اُس نے سلیم کے گھر کا ٹی وی نہیں بلکہ کسی اور کا ٹی وی توڑا تھا مگر دل میں ایک سکون سا محسوس کیا۔

حافظ صاحب! پانی لیجئے۔ شخص لوٹے میں پانی لایا۔

اُس نے لوٹا منہ سے لگایا اور آدھا لوٹا ایک ہی سانس میں پی گیا۔ اسی دوران وہ جوان شخص دوبارہ گھر سے باہر نکلا۔

دل چاہتا ہے کہ تمہارا منہ کالا کر کے، گدھے پر بٹھا کر پورے شہر میں گھماؤں۔ تمہیں یہ بھی پتہ نہیں کہ ٹی وی اور سی ڈی دیکھنا جائز نہیں۔ اسی لیے تو ہم نے پابندی لگائی ہے۔ تمہیں اچھی طرح پتہ ہے پھر بھی یہ کام کرتے ہو۔ عبد الولی نے اُس جوان شخص سے کہا۔

حافظ صاحب! غلطی ہو گئی آئندہ پوری زندگی میں ایسا کام نہیں کرونگا۔ اس دفعہ معاف کریں۔ شخص نے کانوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

خیر آج تو بیوی کی وجہ سے بچ گئے۔ اگر آئندہ ایسی غلطی کرنے کی کوشش کی تو پھر مجھے پتہ ہے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔

چلو چلیں یہاں سے۔ عبد الولی نے ساتھیوں سے کہا۔

مغرب کی نماز کے بعد وہ اپنے اوطاق پہنچے۔ وہاں اوطاق میں اور طالبان بھی آئے تھے جس میں اُس کے حجرے کا دوست روزی خان بھی تھا۔ عبد الولی روزی خان کے ساتھ گرجوٹی سے ملا۔ پھر اُسے اپنے کمرے میں ساتھ لے گیا۔

ملا روزی خان اخوند! خدا خیر نصیب کرے۔ یہ کیا آپ کیسے اس طرف آنکلی۔

عبد الولی نے پوچھا۔

تم تو ویسے بھی حال نہیں پوچھتے اس لیے مجھے خود ہی آنا پڑا۔ روزی خان نے جواب دیا۔ کہاں ہو، کیسے ہو، کیا کر رہے ہو؟ عبد الولی نے سوالوں کے پل باند دیے۔

عبد الولی اخوند! بالکل ٹھیک ہوں، ایک چھوٹی سی امامت ہے جس پر گھر کا گزارا ہوتا

ہے۔ روزی خان نے جواب دیا۔

گھر بھی ڈھونڈا ہے یا پھر باپ کے گھر کی بات کر رہے ہو۔ عبد الولی نے آنکھ مارتے

ہوئے کہا۔

باپ کا گھر کہاں ہمارا تھا۔ اپنا گھر ہے، ملائی ہے، دو بچے ہیں۔ مقتدیوں نے مسجد کیساتھ ایک چھوٹا گھر دیا ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ روزی خان نے اپنا حال بیان کیا۔ اس طرف کیسے آنا ہوا، جہاد کیلئے تو نہیں آئے؟ عبد الولی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کیا ملائی کے ہاتھوں گھر سے نکلوانا ہے، چھوڑو یا جہاد کو۔ تم تو جانتے ہو کہ مولوی ملائی کی باتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ روزی خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ مجھے نہیں پتہ کہ اُس میں کیا کرامات ہوتی ہیں۔ جس طالب نے بھی شادی کی ہے وہ پھر گھر سے نکلتا تک نہیں۔ عبد الولی نے کہا۔

عبد الولی اخوند! ہمارے ہی کیا اور زندگی میں بس یہی ایک ملائی ہی ہے جس کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ اور تو ہم پر سب حرام ہیں۔ اور اگر جب دل چاہے بھی تو دنیا کی شرم سے نہیں کر سکتے۔ روزی خان نے اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ کیا مطلب؟ کیا دل چاہتا ہے۔ عبد الولی نے پوچھا۔ مطلب و مطلب چھوڑو یہ بتاؤ ملائی ڈھونڈ لی ہے یا پھر ابھی تک کنوارے ہو۔ روزی خان نے عبد الولی کی بات ٹال دی۔

جب یہاں سے فارغ ہو جاؤں تو پھر ملائی کے بارے میں سوچو نگا۔ فی الحال تو اسی طرح ہوں جیسے پہلے تھا۔ تم کہو، وطن میں کیا حال ہے۔ مدرسہ کے دوست کیسے ہیں؟ عبد الولی نے پوچھا۔

عبد الولی اخوند! وطن اسی طرح ہے جیسے تھا۔ لوگوں کے پاس دولت زیادہ ہے جو فضول کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔ مگر مولوی اور طالب نے ابھی تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا۔ وہی پرانی ریت، زکوٰۃ اور خیرات پر گزارا۔ روزی خان نے کہا۔

مولوی تو بھرا پیٹ کھاتا ہے مگر بھوکا، بھوکا تو طالب بیچارہ رہتا ہے۔ اُسے کون پوچھتا ہے۔ اگر گاؤں میں کوئی فونگی ہو، قرآن خوانی ہو یا پھر کسی بچے کے کان میں آذان دینا ہو تو پھر طالب ہر کسی کو یاد ہوتا ہے ورنہ طالب تو ایسا ہے جیسا ایک فقیر۔ عبد الولی نے کہا۔

عبد الولی اخوند! مولوی اور طالب میں کوئی خاص فرق نہیں۔ روزی خان نے کہا۔

کیوں بھول گئے ہمارے مدرسہ کے مہتمم کو۔ کیسے وہ اپنے اور اپنے گھر کیلئے گوشت لے جاتا۔ لوگ اُسے ہمارے لیے چندہ دیتے مگر وہ خود اپنے لیے گوشت لے جاتا۔ میں جس مدرسہ میں سب سے پہلے ابتدائی درس پڑھنے گیا تو وہاں کا مولوی اور ملائی ہر روز گوشت کھاتے۔ وظیفے میں اکھٹا کرتا ان کیلئے۔ ایک دن مجھے انہوں نے یہ نہیں کہا کہ آج ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ عبد الولی نے کہا۔

عبد الولی اخوند! تم بھی کمال کرتے ہو جب طالبی کے دور میں اتنی بھوک و افلاس گزاری ہو تو اتنا حق تو بتا ہے۔ جب مولوی بنے تو آرام سے زندگی گزارے۔ روزی خان نے کہا۔
روزی خان اخوند! طالب کی بھی عجیب زندگی ہوتی ہے۔ بھوک، گرمی، سردی میں بڑی ہمت اور محنت سے پڑھتا ہے۔ پھر جب دستار بندی ہوتی تو ناختم ہونے والی بے روزگاری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر جسے پیش امام کی نوکری ملے تو وہ بادشاہ کا بھانجا بن جاتا۔ اور کام کاج کا نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں سکول والے اچھے ہیں۔ سب کچھ ان کیلئے ہے۔ ہمارے لوگ پتہ نہیں اتنے زیادہ مدارس کیوں بناتے ہیں۔ عبد الولی نے چند الفاظ میں طالبان کی زندگی کی تصویر پیش کی۔

تمہاری بات ٹھیک ہے عبد الولی اخوند! خدا افغانستان میں امارت اسلامی کو کامیابی نصیب کرے۔ طالبان کے یہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ روزی خان نے خوشامد کے انداز میں کہا۔
حافظ صاحب! کھانا تیار ہے آجائیں۔ ایک چھوٹے طالب نے عبد الولی سے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد پھر دونوں اپنے کمرے میں آگئے۔ عبد الولی نے روزی خان سے

پوچھا۔

تم نے بتایا نہیں کیسے آنا ہوا؟

عبدالولی اخوند! دو سال پہلے میں نے یہاں دو نوجوان بھیجے تھے۔ آج تک ان کا کوئی اتہ پتہ نہیں۔ والدین نے بہت تنگ کیا ہے۔ کہتے ہیں خود تو بیٹھے ہو اور ہمارے بچوں کو بھیج دیا۔ نا کوئی حال نا احوال مجبور ہو کر آنا پڑا۔ پتہ چلا تم یہاں اچھے عہدے پر ہو ہو سکے تو میری مدد کرو۔ روزی خان نے اپنے آنے کی وجہ بیان کی۔

کس کے ساتھ بھیجا تھا؟ عبدالولی نے پوچھا۔

جس مدرسہ سے تم لوگ آئے تھے وہاں سے بھیجا تھا۔ پھر کئی بار پوچھا مگر انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب کچھ دنوں پہلے بعض شہدائے گئے، ان کے والدین کو بھی تشویش لاحق ہے۔ روزی خان نے جواب دیا۔

خدا سب خیر کرے گا۔ یہاں میرے ساتھ کچھ دن گزار لو، پر دیسی بھی ہو جاؤ گے اور جوانوں کا حال بھی معلوم ہو جائے گا اگر خدا نے چاہا تو۔ عبدالولی نے کہا۔

(۱۴)

ایک ہفتے بعد عبد الولی نے ملا روزی خان سے کہا۔

تیار ہو جاؤ جانا ہے۔ قندھار کے بڑے جیل کے جیلر سے ملنے۔ میں نے سنا ہے کہ انہیں کچھ طالبان قیدیوں کے بارے میں معلومات ہے، اُس کے پاس کچھ ہزارہ بھی قید ہیں جو طالب اُن کے پاس قید ہیں اُن کے نام والی صاحب نے دیے ہیں۔ اُن کے بدلے ہزارہ قیدیوں کی چھوڑنے کی بات ہوئی ہے۔ جیلر میرا دوست ہے، اُن سے معلوم کرتے ہیں۔ اگر یہ جوان وہاں ہوئے تو ٹھیک اور اگر وہاں نہ ہوئے تو دوسری لسٹ ہے۔ جو طالبان شہید ہوئے ہیں اُس میں دیکھ لیتے ہیں۔ یہ لسٹ والی صاحب کے دفتر میں ہے۔ ہر کسی کو وہ نہیں دکھاتے۔

کس وقت جانا ہے؟ روزی خان نے پوچھا۔

کل صبح سویرے اگر خدا نے چاہا، تاکہ وہاں وقت پر پہنچ سکیں۔ عبد الولی نے کہا۔
دوسری صبح عبد الولی، روزی خان اور تین دوسرے طالبان گاڑی میں سوار ہو کر قندھار کی طرف روانہ ہوئے۔ ساڑھے دس بجے انہوں نے قندھار جیل کے سامنے گاڑی کھڑی کی۔ ایک طالب نے جا کر جیل کے چوکیدار سے عبد الولی کے بارے میں کہا۔ کچھ دیر بعد یہ لوگ جیلر کے دفتر میں بیٹھے تھے۔

حافظ صاحب! خدا کرے کہ آپ ہمیشہ یہاں تشریف لائیں۔ بہت دل چاہ رہا تھا کہ آپ سے ملوں مگر کیا کروں حالات ہی ایسے ہیں کہ فرصت نہیں ملتی۔ اچھا ہوا آپ خود تشریف لے آئے۔ جیلر جو کہ شکور اخوندزادہ کے نام سے مشہور تھانے اپنی خوشی کا اظہار کیا۔

اخوندزادہ صاحب! یہ آپ لوگوں کی محبت ہے جو مجھ جیسے ملنگ آدمی کی ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا لیکن مجبوری وہی جو آپ نے بیان کی۔ عبد الولی نے کہا۔

خدا آپ جیسے ملگوں کی تعداد میں اضافہ کرے تاکہ زمین سے تمام منکرات ختم ہو جائیں۔ آپ کی کارکردگی قابل تعریف ہے۔ عموماً مجالس میں آپ کی کارکردگی کا ذکر ہوتا ہے۔ شکور اخوندزادہ نے جواب دیا۔

اخوندزادہ صاحب مجھے معلوم نہیں کہ اچھا کر رہا ہوں یا برا۔ مگر اپنے بس اور علم کے مطابق اپنی ذمہ داری سرانجام دے رہا ہوں۔ عبد الولی نے کہا۔

حافظ صاحب! آپ کی بات سے یاد آیا۔ یہاں جیل میں ایک عجیب آدمی ہے۔ عمر پچاس کے لگ بھگ ہے۔ جب سے میں آیا ہوں قریباً ایک سال ہونے کو ہے میں نے اس شخص کو سوتے نہیں دیکھا۔ ہمیشہ اچھی اور بڑی باتوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ انہوں نے ایک نظریہ تخلیق کیا ہے۔ میری اُن سے اتنی زیادہ باتیں نہیں ہوئیں، طالبان کہتے ہیں کہ پہلے وہ تحریک کا ساتھی تھا مگر اب وہ جیل میں ہے۔ شکور اخوندزادہ نے عبد الولی سے کہا۔

اس شخص سے ملنا پڑے گا تاکہ اس کے نظریے کو سمجھ سکوں۔ عبد الولی نے شخص سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔

کیوں نہیں۔ شاید آپ اور وہ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔ اخوندزادہ نے کہا۔
اخوندزادہ صاحب! آدمی سے بھی مل لیں گے پہلے جس کام کیلئے ہم آہیں ہیں اگر آپ اُس کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔ عبد الولی نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔
کیوں نہیں، کیسا کام ہے، آپ حکم کریں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ شکور اخوندزادہ نے کہا۔

حکم نہیں عرض ہے۔ یہ میرا بہت قریبی دوست ہے ملا روزی خان اخوند۔ ان کا ایک کام ہے اگر معلومات کروادیں تو بہت مہربانی ہوگی۔ عبد الولی نے روزی خان کو متعارف کروایا۔

پھر عبدالولی نے روزی خان اخوند سے کہا کہ آپ خود بیان کریں۔ ملاروزی خان اخوند نے شکور اخوندزادہ کو اپنا مسئلہ بیان کیا۔ پھر دونوں کاغذوں کے ڈھیر میں دیکھنے لگے۔ عبدالولی جیل میں اُس شخص کے پاس گیا جس کا ذکر شکور اخوندزادہ نے کیا تھا۔

حافظ صاحب! یہ وہ بوڑھا ہے۔ ایک طالب نے عبدالولی کو ایک شخص کے سامنے کھڑا کیا جو اپنے بیرک میں دروازے کے ساتھ بیٹھا تھا۔

السلام علیکم! عبدالولی نے شخص کو سلام کیا۔

وعلیکم السلام! ماندہ نہ باشی۔

زندہ باشی۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے۔ عبدالولی نے اپنے مزاج کے برعکس نرم لہجے

میں کہا۔

طبیعت۔۔۔۔۔۔ بوڑھا شخص مسکرایا۔ جیل میں کسی کی طبیعت کیسی ہو سکتی ہے۔ بوڑھے شخص نے عبدالولی کو دیکھا۔

میرا مطلب تھا کہ۔۔۔۔۔۔ عبدالولی کچھ شرمندہ سا ہوا،

نوجوان تم شرمندہ نہ ہو، یہ تو روایتی حال احوال ہیں۔ کوئی پرواہ نہیں۔ تم بتاؤ، تم کس مقصد سے آئے ہو۔ مجھے تو ایک سخت جان طالب دکھائی دیتے ہو۔ بوڑھے شخص نے عبدالولی سے کہا۔

چچا یہ سخت جان کیا ہے۔ میں کچھ سمجھا نہیں، میں ایک طالب ہوں اور بس۔ یہ سخت جان اور نرم کام میں فرق نہیں کر سکتا۔ عبدالولی وہی بوڑھے کے قریب بیٹھا۔

اتنے معصوم بھی نہیں ہو، جو سخت اور نرم کو نہیں سمجھتے۔ بوڑھے نے کہا۔

آپ تو واقعی دلچسپ آدمی ہیں۔ عبدالولی نے بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

تمھاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم خاص مجھ سے ملنے آئے ہو۔ بوڑھے نے کہا۔

شکور اخوند نے آپ کے بارے میں بتایا تو دل نے چاہا کہ آپ سے مل لوں۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

شکور اخوند زادہ بھی ایک سخت جان طالب ہے، تم کیا کہتے ہو؟ بوڑھے نے ایسے انداز میں پوچھا جیسے وہ عبد الولی کو پہلے سے جانتا ہو۔

چچا میں نے پہلے بھی کہا کہ میں سخت اور نرم کو نہیں سمجھتا۔ کون سخت اور کون نرم ہے۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

تمھاری کونسی ذمہ داری ہے؟ بوڑھے نے عبد الولی سے پوچھا۔

ایک شرط پر بتاؤنگا۔ عبد الولی نے کہا۔

کیوں نہیں، میں تو ایک کھلی کتاب ہوں جو ہر کوئی پڑھ سکتا ہے۔ بوڑھے نے طنزیہ انداز میں کہا مگر عبد الولی سمجھ ناسکا۔

میرا نام عبد الولی ہے، اس صوبے کے ایک ضلع میں " امر بی المعروف ونہی عن المنکر " کی ذمہ داری کندھوں پر ہے۔

خیر خدا خیر۔۔۔ عبد الولی نے بات پوری نہیں کی تھی کہ بوڑھے نے اپنے آپ سے کہا۔ بوڑھے نے یہ ایسے انداز میں کہا کہ عبد الولی کو ہنسی آگئی۔

یہ کیا بیوہ عورتوں کی بات کر ڈالی۔ عبد الولی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

درس کتنا پڑھا ہے؟ بوڑھے نے پوچھا۔

قرآن شریف حفظ کیا ہے اوہدایہ پڑھا ہے کہ جہاد کیلئے نکل پڑا۔

حافظ ہو۔ حافظ تو اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں سر پر بٹھایا جائے۔ بوڑھے نے عبد الولی کو پیار سے دیکھا پھر پوچھا۔ تمھیں جو ذمہ داری سونپی گئی ہے تمھارے خیال سے تم اس کے معیار پر پورے اترتے ہو۔ علم کے راستے دنیا نے جو ترقی کی ہے، بہت چیزیں جو ایجاد ہوئیں ہیں، ان میں عوام کو کس چیز کی ضرورت ہے اور کس چیز کی ضرورت نہیں۔ بہت سی ایسی چیزیں جو

جدید تعلیم کے ذریعے سامنے آئی ہیں بہت منافع بخش ہیں۔ مگر وہ چیزیں تمہارے دین میں منکرات میں سے مانی جاتی ہیں، اس حال میں تمہاری ذمہ داری اور علم تمہیں اس قابل بنا سکتا ہے کہ تم معاشرے اور عوام کے ساتھ انصاف کر سکو۔ یا پھر اُن کو سمجھا سکو کہ کیا بُرا ہے اور کیا اچھا۔ بوڑھے نے ایک عالم کی طرح بات کی۔

عبدالولی حیران ہوا کہ بوڑھا کیا کہہ رہا ہے۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، وہ تو ایک سیدھا سادہ طالب تھا جو حجرے سے میدان جنگ اور پھر میدان جنگ سے ایک خاص ذمہ داری پر۔ حیران تھا کہ کیا جواب دے۔

میں سمجھ رہا ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو میری باتیں تمہیں عجیب لگ رہی ہیں۔ مگر میں کیا کروں عادت سے مجبور ہوں۔ نہ وقت کو دیکھتا ہوں اور نہ موقع کو۔ بس جو منہ میں آیا کہہ دیتا ہوں میرے پاس اور بچا بھی نہیں بس یہی باتیں ہیں جو میرے بس میں ہیں اور تو۔۔۔۔۔ بوڑھے نے عبدالولی کے گٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

چچا! اتنی گہری باتیں کرتے ہو جس کے سمجھنے کیلئے آپ کے جتنی عمر بھی چاہیئے۔ باتوں باتوں میں اپنا وعدہ بھول گئے۔ آپ نے اپنا تعریف نہیں کروایا۔ آپ کون ہیں، یہاں کیسے پہنچے؟ عبدالولی کو بوڑھے کو پہچانا اُس کی باتوں سے زیادہ اہم تھا۔

حافظ صاحب! میرا نام دانش ہے۔ عمر کا پتہ نہیں کہ کتنی ہوگی۔ وہ اس لیے کہ میرے والد ان پڑھ تھے۔ میری تاریخ پیدائش اُسے معلوم نہ تھی۔ اس لیے ملک کے باسی مجھے طعنہ دیتے ہیں کہ میں ان پڑھ باپ کا پڑھا لکھا بیٹا ہوں۔ خیر یہ تو زندگی میں ہوتا رہے گا یہ تو زندگی سے جڑے قصبے ہیں۔

آپ یہاں جیل میں کیسے آئے؟ عبدالولی نے بوڑھے کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔
یہ چھوٹا کرہ دیکھ رہے ہو۔ بوڑھے نے اپنے بیرک کی طرف اشارہ کیا۔
ہاں۔ عبدالولی نے سر ہلایا۔

میری آدمی سے زیادہ زندگی اس میں گزری ہے۔ اس کمرے میں ایسا لگتا ہے جیسے یہ بنایا ہی میرے لیے گیا ہے۔

میرے خیال میں جرم کے ساتھ دوستی بنالی ہے۔ عبد الولی کے مُنہ میں بات نہیں رُکی۔

ہو سکتا ہے اسی طرح ہو۔ بوڑھا مسکراتے ہوئے۔
کس جرم کی سزا گزار رہے ہو؟ عبد الولی کے بوڑھے کے جرم میں دلچسپی پیدا ہوئی۔
میں نے سنا آپ یہاں قیدیوں کو باجماعت نماز پڑھاتے ہو۔ تو پھر-----
عبد الولی نے بات پوری نہ کی۔

تو پھر میں عادی مجرم کیوں؟ یہی کہنا چاہتے ہو۔ بوڑھے نے عبد الولی کو ترچھی آنکھوں سے دیکھا۔

عبد الولی نے اثبات میں سر ہلایا۔

حافظ بھائی! میرا جرم میری زبان ہے۔ بوڑھے نے اپنی زبان نکالی اور اُس پر انگلی رکھی۔

یہ زبان مجھے یہاں پر لے کر آئی ہے۔ اس زبان کے پیچھے جو عقل ہے وہ جو سوچتی ہے یہ سوچ سب سے بڑا مجرم ہے۔ لوگ میری زبان کو تالا لگانا چاہتے ہیں کہ یہ سوچتا ہے، لیکن میری زبان اس پابندی کو نہیں مانتی۔-----

کس طرح کی سوچ بیان کرتے ہو؟ عبد الولی نے پھر بات کاٹی۔

اسی جلد بازی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ جلد بازی مت کرو، تمہارا قیمتی وقت ضائع نہیں کروں گا چند جملوں میں اپنی زندگی کا حال بتا دوں گا سمجھنا تمہارا کام ہے۔ بوڑھے نے عبد الولی سے کہا۔

آئے۔ اسلام کے نام پر اپنے قوانین بنائے۔ اسلام کو اپنی خوشی سے تعبیر کرایا۔ صرف عبادات اور سزا کو مد نظر رکھا۔

میں نے اسے اسلامی نظام کی بجائے مولوی نظام کا نام دیا۔ یہ مجھے یہاں لے کر آئے۔ کہتے ہیں کہ تم مجرم ہو۔ بس میں اس جرم کا عادی ہوں۔ بوڑھے نے چند جملوں میں اپنی زندگی کی سرگزشت بیان کی۔

عبدالولی زور سے ہنسا۔ بوڑھا شخص اُسے دماغی مریض نظر آیا۔ آپ کے خیال میں یہ کیوں ایسا کرتے ہیں؟ عبدالولی نے پوچھا۔

وہ اس لیے کرتے ہیں کہ پیٹھ پیچھے اسلامی لباس میں وہ خفیہ قوتیں نظر آتے ہیں جنہیں یہ دیکھ نہیں سکتے۔ کام وہ کرتے ہیں نام انکا استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ سوچتے ہیں اور اس طرح سوچتے ہیں انہیں اس طرح قید کیا جاتا ہے جس طرح مجھے۔ بوڑھے نے جواب دیا۔ تو آپ کے خیال میں ہمارا نظام اسلامی نہیں ہے، اگر نہیں تو پھر یہ امن، خوشحالی۔ اوہو، میں تو بھول ہی گیا، آپ تو یہاں ہیں آپ کو کیا پتہ کہ باہر لوگ کتنے خوش ہیں۔ عبدالولی نے فخر سے کہا۔

خوش نہیں، ڈر رہے ہیں۔ ڈر کے مارے بچارے کچھ بول نہیں سکتے۔ دونوں یہی باتیں کر رہے تھے کہ ایک طالب آیا اور عبدالولی سے کہا کہ اخوندزادہ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ عبدالولی نے بوڑھے سے رخصت لی، اخوندزادہ کے دفتر میں آیا۔ شکور اخوندزادہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

حافظ صاحب! کہو کیسا تھا بوڑھا شخص؟

اخوندزادہ صاحب! بڑا بے باک شخص تھا جو منہ میں آتا کہہ دیتا۔ اچھی باتیں کر رہا تھا مگر ایک بات پر مجھے شک ہوا کہ وہ ایک دماغی مریض ہے۔ عبدالولی نے جواب دیا۔
کوئی بات پر؟ شکور اخوندزادہ نے پوچھا۔

ہمارے اس نظام کو اسلامی نظام کی بجائے مولوی نظام کہہ رہا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے دماغی مریض لگا۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

آدمی عالم ہے مگر کیا کریں حافظ صاحب۔ اس طرح کے لوگ ہم سے اختلاف رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شروع شروع میں یہ شخص تحریک کا ایک سرگرم رکن تھا۔ پھر بعد میں اس طرح کی باتیں کرنے لگا۔ خیر یہ تو ہوتا ہے۔ ہم کسی کا منہ نہیں سی سکتے۔ اخوند زادہ نے کہا۔ میں نے ملا روزی خان اخوند کو تمام معلومات فراہم کرائیں ہیں۔ اب چلتے ہیں کھانا کھانے، اس کے بعد میں آپ لوگوں کو رخصت دوں گا۔

(۱۵)

عبدالولی اللہ داد کے بارے میں بہت فکر مند تھا۔ فکر مندی کے ساتھ ساتھ بور بھی ہو رہا تھا۔ اُس کی زندگی میں اللہ داد ہی وہ شخص تھا جس کے ساتھ عبدالولی دل کی بات کہتا۔ تنہائی کے درد کی دوا کرتا۔ اگرچہ عبدالولی اپنے آپ میں ایک پراسرار شخصیت کا مالک تھا اسی لیے اللہ داد کے سوا کوئی بھی اس کے ماضی سے باخبر نہ تھا۔ عبدالولی کو زندگی نے جو کچھ بھی دیا تھا اُس نے شعور کے بجائے لاشعور میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ وہ خواہشات اور ارمان جو بچپن سے اُس کے دل و دماغ میں پل رہے تھے حالات نے بجائے پورے کرنے کے ادھورے چھوڑ دیے۔ ان ادھوری خواہشات اور ارمانوں نے اس کے دل و دماغ کو ایک قبر بنا رکھا تھا۔ اس قبر کے مجاور کا حق صرف اللہ داد کو دیا تھا۔ اس لیے کہ اُس نے اور اللہ داد نے اپنے ارمان اس قبر کو سونپے تھے۔

اللہ داد کا کوئی حال احوال بھی نہیں آیا تھا۔ وہاں میدان جنگ بھی کچھ زیادہ گرم ہو چکا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد عبدالولی اپنے کمرے میں آیا۔ سٹائٹ فون پر کئی جگہوں کی معلومات اکٹھی کی لیکن حالات کچھ تسلی بخش نہ تھے۔ اللہ داد کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل نہ ہوئیں۔ اسی سوچ میں عبدالولی اپنی بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ مختلف قسم کے خیالات اُس کے دماغ میں آرہے تھے۔ وہ جتنی دیر آنکھیں بند کرتا نیند اتنی دور چلی جاتی۔ اسی کشمکش میں بالآخر اُسے نیند آگئی۔ وہ پھر سے وہی خواب دیکھ رہا تھا جو وہ ہر وقت دیکھتا آ رہا تھا اس دفعہ خواب میں اس کے سینے کی روشنی ایسی ماند پڑ گئی تھی جیسے ڈھلتا سورج، نارنجی روشنی کی طرح۔ عبدالولی پریشان تھا کہ یہ روشنی نارنجی کیوں ہو گئی، اسی پریشانی میں تھا کہ اژدھا نظر آ گیا۔ مُنہ کھلا ہو اور روشنی کے سامنے بیٹھا بچوں کی تعداد میں بھی کمی آئی تھی۔ اژدھا کے آنے سے تمام بچے ایک دوسرے سے چمٹنے لگے۔ اژدھا اچانک ایک بچے کی طرف بڑھا۔ عبدالولی اُس کی طرف لپکا۔ اس کشمکش میں آنکھ کھل گئی۔ اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس کے حواس اپنی جگہ پر نہیں آئے تھے کہ کمرے کا دروازہ کھٹکا۔ اُسے ایسے لگا جیسے دروازے پر اژدھا ہو۔ وہ خوف زدہ ہو کر دروازے کی طرف

دیکھنے لگا پھر سر ہانے پڑے کلاشکوف کی طرف ہاتھ بڑھایا، کلاشکوف اٹھاتے ہی آواز دی۔ کون ہو؟

میں محمد گل ہوں حافظ صاحب۔ باہر سے جواب ملا۔
اُس نے واپس کلاشکوف رکھی اور جا کر دروازہ کھولا۔
ہاں محمد گل اخوند! کیا بات ہے جو آدھی رات کو دروازہ کھٹکھٹا رہے ہو۔ خیر تو ہے۔
عبدالولی نے پوچھا۔

حافظ صاحب! دو طالبان آئیں ہیں، کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ابھی حافظ صاحب سے ملانا ہے۔ ایک ضروری پیغام دینا ہے۔ محمد گل نے کہا۔
کہاں سے آئے ہیں، ضلعی امیر نے بھیجے ہیں یا پھر والی صاحب نے یا پھر کہیں اور سے؟
عبدالولی نے پھر پوچھا۔

والی یا ضلعی امیر کے طرف سے نہیں آئے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ ایک لمبا سفر طے کر کے آئے ہوں اور بہت دور سے آئے ہوں۔ محمد گل نے جواب دیا۔
جاؤ لے آؤ، جلدی۔ عبدالولی واپس کمرے کے اندر گیا۔
محمد گل اُن دونوں طالبان کو کمرے میں لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد کالا عمامہ باندھے عبدالولی کمرے سے نکلا اور محمد گل کو آواز دی۔

محمد گل اخوند، جلدی سے گاڑی نکالو۔ عبدالولی کی آواز کانپ رہی تھی۔
حافظ صاحب! خیر تو ہے پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ گل محمد نے پوچھا۔
تم جلدی کرو گاڑی نکالو شاباش، تم بھی ساتھ چلو بارڈر (ویش) تک۔ پھر واپس گاڑی لے کر آ جاؤ گے۔ عبدالولی نے کہا۔

محمد گل نے جب عبدالولی کی حالت کو دیکھا تو دوبارہ پوچھنے کی جرات نہ کر سکا اور بھاگ کر گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی سٹارٹ کی۔ دونوں روانہ ہوئے، بارڈر پہنچتے ہی عبدالولی نے محمد گل

کو رخصت کیا، خود دروازے کی طرف بڑھا۔ گرچہ بارڈر کا دروازہ بند تھا اور صبح سورج نکلنے کے ساتھ ہی لوگوں کی آمد و رفت کیلئے کھلتا مگر عبد الولی ان تمام پابندیوں سے آزاد تھا۔ کسی نے اُس کا راستہ نہ روکا۔ جیسے ہی سورج کی کرنیں شفق سے نظر آئیں عبد الولی درہ خوبک (کوٹک) کو عبور کر چکا تھا۔ عبد الولی نے بارڈر سے ایک مخصوص گاڑی اپنے لیے کرایہ پر لی، اکیلا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ مگر گل بارڈر تک اُس کے ساتھ تھا۔ بارڈر کراس کرنے کے بعد عبد الولی نے اپنا سفر اکیلا جاری رکھا۔ عبد الولی گاڑی میں ایسے بیٹھا تھا جیسے کانٹوں پر۔ دل چاہ رہا تھا کہ گاڑی اڑے اور اُسے کو سُنہ تک پہنچا دے۔ ذہن میں مختلف خیالات آرہے تھے۔ مریچکا ہو گا۔۔۔ نہیں خدا نہ کرے۔ پھر وہ سر کو ہلاتا دیتا۔ کتنا زخمی ہو گا جو اتنی جلدی کو سُنہ پہنچایا گیا ہے۔ ضرور بہت زخمی ہو گا۔

عبد الولی کو آئے ہوئے طالبان نے کہا کہ ملا اللہ داد اخوند جنگ میں زخمی ہوا ہے اور اُسے سراچہ گاڑی میں کو سُنہ لے گئے ہیں۔ ہم آپ کے پاس اس لیے آئیں ہیں کہ اللہ داد اخوند کی خواہش تھی کہ عبد الولی کو اُس کے بارے میں بتایا جائے۔ میرا سب کچھ وہی ہے۔ نہ دنیا میں میرا کوئی اپنا ہے نہ دوست۔ عبد الولی میرا بھائی بھی ہے اور میرا دوست بھی۔ عبد الولی کبھی ایک سائیڈ پر بیٹھ جاتا تو کبھی دوسری سائیڈ پر۔ کبھی عمامہ کھول کر گود میں ٹوپی کے ساتھ رکھ دیتا یا پھر واپس باندھ لیتا۔ جب کبھی آنکھوں میں آنسو آجاتے تو چپکے سے اُسے عمامہ سے صاف کر لیتا۔ پھر وہ چپکے ڈرائیور کو دیکھتا کہ آنسو تو نہیں دیکھے۔ چمن سے کو سُنہ تک تین گھنٹوں کا سفر تین صدیاں لگنے لگی۔ عبد الولی سیٹ پر ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے ہوئے اپنے خیالوں میں اللہ داد کے ساتھ باتیں کر رہا تھا کہ ڈرائیور نے کہا۔

مولوی صاحب! جیلانی ہسپتال پہنچ چکے ہیں۔

عبد الولی عمامہ اوٹوپی ہاتھ میں لیے نیم چپل پہنے گاڑی سے اترا اور ہسپتال کی طرف

دوڑنے لگا۔

مولوی صاحب! عمامہ سنبھالو۔ ڈرائیور نے پیچھے سے آواز دی۔ لیکن وہ ڈرائیور کی کہاں ٹن رہا تھا۔ سیدھا چھ ہسپتال کے شیشے کے کبین یعنی استقبالیہ پر گیا۔ اُس کے بعد ہسپتال کے چوتھے فلور پر گیا۔ ایک کمرے کے سامنے ایک طالب کھڑا تھا۔ جیسے ہی عبد الولی پر نظر پڑی کہنے لگا۔

حافظ صاحب! اللہ داد! اخوند اس کمرے میں ہے۔

کس کمرے میں ہے؟ کیسا ہے وہ؟ عبد الولی لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔

اس کمرے میں، ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ طالب نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

عبد الولی نے جلدی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور کمرے کے اندر داخل ہو گیا۔ کمرے

میں دو طالبان اور ایک ڈاکٹر جو کہ اللہ داد کی نبض دیکھ رہا تھا آنکھیں بند تھیں، آنکھیں کھول دیں۔

آرام سے، انسان نہیں ہو کیا؟ ڈاکٹر نے عبد الولی سے کہا۔

عبد الولی جیسے اُس نے ڈاکٹر کی بات نہ سنی ہو اللہ داد کے قریب گیا۔ بیٹھے دو طالبان میں

سے ایک بڑے طالب جو کہ لمبی داڑھی والا تھا عبد الولی سے گلے ملا۔

حافظ صاحب! اللہ داد! اخوند ٹھیک ہے۔ ابھی آپریشن ہوا ہے تا حال ہوش میں نہیں

ہے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ طالب نے ایک ہی سانس میں تمام حال بیان کیا۔

عبد الولی ہاتھ اٹھائے نظر اللہ داد کے چہرے پر مرکوز کیے ہوئے حیران کھڑا تھا۔

طالب نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کمرے میں پڑی ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ لیکن عبد الولی کی

نظریں اللہ داد کے چہرے سے نہیں ہٹ رہی تھیں اور نہ ہی وہ آنکھ چمک رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد

دو موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے اُس کی دونوں آنکھوں سے پھلک پڑے اور آہستہ سے

چہرے پر بہہ کر داڑھی میں غائب ہو گئے۔ ایسے غائب ہوئے جیسے عبد الولی اور اللہ داد اس دنیا کے

جنگل میں وقت کے جبر نے انہیں اپنوں سے جدا کر کے غائب کیا تھا۔ پھر سر کرسی پر رکھ کر

آنکھیں بند کر لیں۔ وہ طالب جس نے عبد الولی کو کرسی پر بٹھایا تھا نے کہا۔

حافظ صاحب! کوئی چائے منگواؤں؟
عبدالولی نے اپنا سر کرسی سے اٹھایا، ادھر ادھر دیکھا۔ ڈاکٹر جاچکا تھا۔
چائے۔۔۔۔۔ عبدالولی نے طالب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو تمہاری مرضی۔
اس طالب نے باہر کھڑے طالب سے کہا۔
جلدی جاؤ۔۔۔۔۔ دودھ والی چائے اور پر اٹھے لے آؤ۔

(۱۶)

چار دن گزر جانے کے بعد اللہ داد کو ہوش آگیا۔ عبد الولی نے چارپائی کے نزدیک بیٹھا
آہ سنی۔ جلدی سے اٹھ کر اُس کے قریب کھڑا ہوا۔

اللہ داد اخوند! مہم۔۔۔ میں ہوں۔۔۔۔۔ عبد الولی۔ عبد الولی نے اللہ داد کا ہاتھ پکڑتے
ہوئے اللہ داد سے کہا۔

اللہ داد نے آنکھیں کھول دیں، ادھر ادھر دیکھا۔ جیسے ہی عبد الولی پر اُس کی نظر پڑی
تو ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ سر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ عبد الولی نے اُس کے ماتھے پر
ہاتھ رکھا۔

اٹھنا مت۔ عبد الولی نے کہا۔

اللہ داد نے سر الپس رکھ دیا۔ عبد الولی نے اُس پر چادر ٹھیک کی پھر اُس کے سر ہانے
چارپائی پر بیٹھ گیا۔

مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گے۔ اللہ داد نے ضعیف آواز میں کہا۔

تم اس حال میں ہو اور میں نہ آؤں یہ ہو نہیں سکتا۔ تمہیں پتہ ہے کہ مجھ پر یہ تمام
راتیں کیسی گزری ہیں، ایسے جیسے انگاروں پر کھڑا ہوں۔ عبد الولی نے شفیق بھائی کی طرح اُس کے
ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔

میں سمجھتا ہوں۔ ہم طالبان کا طالب کے سوا کوئی غم خوار نہیں۔ میرا تو کوئی بھی نہیں۔
اللہ داد کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ عبد الولی کی آنکھوں میں بھی آنسو آگئے۔ پھر اپنے کالے عمامہ
سے پہلے اللہ داد کے پھر اپنے آنسو پونچھے۔

تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ہم طالبان ہی ایک دوسرے کی مائیں بھی ہیں، بہنیں بھی اور
بھائی بھی۔ تمہیں یاد ہے جب مجھے مدرسہ میں بخار ہوا تھا تو تم نے میرا سر اپنی گود میں رکھا۔ گویا
رکپڑا میرے ماتھے پر رکھتے۔ میری ماں نے یہ سلوک میرے ساتھ نہیں کیا۔ عبد الولی نے کہا۔

اور جو تم ماں، ماں پکار رہے تھے وہ؟ اللہ داد مسکرایا۔
 ماں کی جگہ تم ماں بن کر کھڑے تھے۔ وہ جو مولوی صاحب سے چوری چھپے پیاز اور آلو
 کی بخنی بنا کر دی۔ عبد الولی نے کہا۔
 اور کھائی بھی نہیں۔ وہ چوری بھی بڑے وہم میں کی تھی۔ دونوں ہنس پڑے۔ اسی اثنا
 کچھ ڈاکٹر زکمرے میں داخل ہو گئے۔

مولوی صاحب! کیسا ہے آپ کا مریض اب؟ ایک ڈاکٹر نے عبد الولی سے پوچھا۔
 ڈاکٹر صاحب! ابھی کچھ ہی دیر ہوئی ہے کہ ہوش میں آیا ہے۔ عبد الولی نے خوش
 ہوتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا تھا کہ ٹھیک ہو جائے گا مگر تم بہت بے صبر ہو۔ ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔
 کیا کرتا، دل بے صبر تھا۔ عبد الولی نے کہا۔
 میں نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ یہ تمہارا کون ہے۔ ڈاکٹر اللہ داد کے قریب گیا۔
 دوست ہے میرا، بچپن کا دوست۔۔۔۔۔ سب کچھ ہے میرا۔ عبد الولی نے کہا۔
 مولوی صاحب! آپ طالبان لوگوں کا بھی عجیب تعلق ہے ایسے ہو جیسے ایک باپ کی
 اولاد۔ ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہو، میں نے کسی بھی طبقے میں اتنی محبت نہیں دیکھی
 جتنی تم لوگ ایک دوسرے سے کرتے ہو۔ ڈاکٹر نے اللہ داد کے زخم سے پٹی اُتارتے ہوئے کہا۔
 ڈاکٹر صاحب! ہمارا ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہیں محبت کیلئے۔ سب کچھ یہی ہے۔
 ہماری دنیا طالب سے شروع ہوتی ہے اور طالب پر ختم۔ نہ کوئی ہمیں خوشی میں شریک کرتا ہے نہ
 کوئی غم میں۔ غم اور خوشی میں صرف دُعا کیلئے بلاتے ہیں، دنیا نے ہماری ہر چیز سے آنکھیں پھیر لی
 ہیں، اسی لیے ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ عبد الولی نے جواب دیا۔
 ابھی تو آپ لوگوں کی بادشاہت ہے، پورا افغانستان آپ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔
 ڈاکٹر نے کہا۔

وہ بھی تو آپ لوگوں کی آنکھوں میں خیرہ ہے۔ عبد الولی نے کہا۔
ایسا کرو یہ زخم دھولو۔ ڈاکٹر نے نرس سے کہا۔ جب زخم صاف ہو تو ڈاکٹر نے عبد الولی
سے کہا۔ پریشان نہ ہوں بہت جلد آپ کا دوست ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر کچھ دوائیاں عبد الولی کو لکھ
کر دی اور خود نکل گیا۔

(۱۷)

اللہ داد آہستہ آہستہ ٹھیک ہونے جا رہا تھا۔ اب اُس نے کھانا پینا بھی شروع کیا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہا تھا کہ ایک ہفتے بعد اُسے ہسپتال سے رخصت کیا جائے گا۔ عبد الولی نے باقی طالبان کو رخصت کیا تھا اور خود اللہ داد کے ساتھ تھا۔

عبد الولی ہر روز عصر کی نماز کے بعد ہسپتال کے باہر ایک میڈیکل سٹور کے ساتھ تھڑے پر چادر بچھائے بیٹھا مغرب تک سڑک کا نظارہ کرتا اور ایک کپ دودھ پتی چائے بھی پیتا۔ اس میڈیکل سٹور میں ہر روز ایک آدمی اُس سے پہلے آتا۔ میڈیکل سٹور میں کرسی پر بیٹھے پیٹھ پیچھے کر کے میڈیکل کے مالک سے گپ شپ کرتا۔ عبد الولی اُن کی باتیں سنتا۔ وہ لوگ ہمیشہ سیاست پر بات کرتے۔ کبھی کبھی پشتونوں کے حالات، اُن کی بے سوادگی پر بھی تبصرہ کرتے۔ عبد الولی کبھی اُن کی باتوں پر دھیان دیتا تو کبھی سڑک پر۔ مغرب کی آذان کے ساتھ کھڑا ہو جاتا۔ مگر وہ دونوں وہیں میڈیکل میں بیٹھے رہتے۔

ایک دن جب اللہ داد سو گیا تو وہ کمرے سے باہر نکلا، پھر اپنی جگہ پر چادر بچھا کر بیٹھ گیا۔ میڈیکل سٹور کی طرف جب دیکھا تو وہاں کوئی نظر نہ آیا۔ کچھ فاصلے پر وہ دونوں تھڑے پر ٹیبل کے سامنے بیٹھے تھے اور سامنے چائے بھی پڑی تھی۔ دونوں معمول کے مطابق بحث کر رہے تھے۔ آج عبد الولی اُن کی گفتگو صاف سن رہا تھا۔ وہ شخص جو میڈیکل میں بیٹھ دکھائے بیٹھا تھا کہہ رہا تھا۔ یہ صرف جاہل ہیں جاہل اور بس۔

یوں بھی نہیں ہے جیسے تم کہہ رہے ہو۔ دراصل تم ہر چیز کو این جی او کی نظر سے دیکھتے ہو۔ میڈیکل کے مالک نے کہا۔

عبد الولی کا دھیان اُن کی گفتگو کی طرف گیا۔ اُن کو غور سے دیکھا وہ شخص جس کی پیٹھ میڈیکل میں ہمیشہ اِس کے طرف ہوتی اُس کا چہرہ دیکھا، غور سے دیکھا۔ ایسے اچھلا جیسے سانپ نے ڈسا ہو۔ جس شخص کو اُس نے دیکھا وہ اس کا چچا زاد بھائی سلیم تھا۔ اگرچہ سلیم پہلے سے کچھ موٹا

ہو چکا تھا، سر کے بال بھی گر چکے تھے اور خدو خال میں بھی فرق آیا تھا کلین شیو کرنا تھا اس لیے اسے پچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ اگر اُس کی مونچھ داڑھی ہوتی تو شاید نا پچانا جاتا۔ میں کسی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ خدا نے مجھے عقل اور شعور دیا ہے۔ اپنے شعور کے تناظر میں انہیں دیکھتا ہوں۔ سلیم نے دوسرے شخص کو جواب دیا۔

عبدالولی نے چادر اٹھا کر اپنے سر پر ڈالی اور اُن کی طرف سے مُنہ پھیر دیا اور اُن کی باتیں سننے لگا۔

یہ ہمارے معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو محروم رہ گیا ہے۔ ان کی تربیت ایک خاص بند ماحول میں ہوئی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم انہیں اپنے سے الگ کریں ہمیں چاہیے کہ ہم انہیں اپنا جانے۔ یہ ہمارے بھائی ہیں۔-----

اس سے پہلے کہ شخص بات پوری کرتا سلیم نے اُس کی بات کاٹ لی۔

یار حسن صاحب! تم بھی عجیب شخص ہو، اگر تمہارے جیسا پڑھا لکھا، سیاسی شعور رکھنے والا علاقائی رسم و رواج کو سمجھنے والا، جدید ذہن رکھنے والے لوگ بھی یہ سوچنے لگیں تو ایک عام اور ان پڑھ شخص سے کیا لگے۔ ان طالبان کا مقصد یہی ہے کہ ہمیں ترقی سے روکے۔ یہ رجعت پسند ہمیں دنیا کی برابری سے روکیں۔ تم نے ان کی چہروں کو دیکھا ہے۔ لمبے بال، بڑی داڑھیاں، انسانیت سے دُور۔ سلیم نے نفرت سے مُنہ کو بگاڑا۔ مذہب میرا اپنا کام ہے، میں اُس پر عمل کرتا ہوں یا نہیں۔ یہ لوگ بندوق کی زور پر لوگوں سے کرواتے ہیں۔ پشتون قوم کو پتھر کے زمانے میں لے کر گئے ہیں۔ سلیم نے اپنی بات پوری کی۔

سلیم خان! تم ٹھیک کہتے ہو۔ اگر پشتونوں کی بات کی جائے تو اُس میں، میں اور تم بھی شریک ہیں۔ تم جن لوگوں کے ساتھ کام کرتے ہو یا تمہارے جیسے اور نوجوان جو تعلیم یافتہ ہیں ہر چیز سے باخبر ہیں اور سمجھ رہے ہیں ان تنظیموں کے ساتھ کام کر رہے ہیں میرا مطلب این جی اوز سے ہے، یہ پڑھے لکھے نوجوان جو قوم کا سرمایہ ہیں سمجھتے ہیں کہ پشتونوں کو ترقی کی راہ پر گامزن

کر رہے ہیں مگر یہ پشتونوں کو بیگانگی کی راہ پر لے جانا چاہتے ہیں۔ معذرت کے ساتھ، جن لوگوں کی تربیت ابن جی اوز کے سایہ تلے ہوئی ہے وہ لوگ بھی انتہا کو پہنچے ہیں۔ جو طالب تھیں انتہا پر دکھائی دے رہا ہے اُس کے دوسرے سرے پر تمہارے جیسے لوگ ہیں۔ تم عورتوں کی آزادی کی بات کرتے ہو؟ شخص نے سلیم سے پوچھا۔

ہم صرف عورتوں کی آزادی کی بات نہیں کر رہے، ہم چاہتے ہیں کہ قوم کو مذہب کے افیم سے نجات دلائیں۔ مذہب تو افیم کی طرح نشے میں مبتلا کرتا ہے۔ پھر اُن کی عقل کام نہیں کرتی جیسے ہمارے دوست۔ سلیم نے مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

عورتوں کی آزادی سے تمہارا کیا مطلب ہے؟ حسن نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزاریں جیسے کہ مرد کو معاشرے میں جتنی آزادی حاصل ہے اتنی آزادی عورتوں کو بھی حاصل ہو۔ معاشرے میں وہ آگے بڑھے تاکہ ملک کی ترقی میں حصہ ڈال سکیں۔ ایسا نہیں کہ اُسے اپنے گھر میں قید کریں یا پھر بڑے بڑے برقعے پہنائے جائیں جیسے قفس پر پردہ ڈالا جائے۔ سلیم نے واضح الفاظ میں کہا۔

تم نے اپنے گھر میں اس آزادی کا کتنا خیال رکھا ہے۔ تمہاری ماں، بیوی اور بہن کو یہ آزادی حاصل ہے۔ جس آزادی کی تم مانگ کر رہے ہو؟ حسن نے پھر سوال کیا۔

یہ آزادی میں اُس وقت دو ٹوکا جب پورے ملک میں آزادی آجائے۔ میں اکیلے یہ کام کیسے کر سکتا ہوں۔ سلیم نے جواب دیا۔

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی تک تم نے اپنے اوپر یہ چیز لاگو نہیں کی اور نہ ہی عملی جامہ پہنایا ہے۔ صرف باتوں کی حد تک اس آزادی کے قائل ہو۔ تم پہلے دوسرے کی عورتوں کیلئے آزادی چاہتے ہو پھر اپنے عورتوں کو آزادی دو گے۔ یہ بات بہت خطرناک ہے، اس طرح کا نقطہ نظر معاشرے کو انتشار کی طرف لے جاتا ہے۔ اگر کوئی تبدیلی لانا چاہتا ہے تو اس کے قول اور فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہیے۔ میں جتنا بھی طالبان کے خلاف بات کروں مگر یہ بات مانتا ہوں جو

انہوں نے کہا ہے اس پر عمل بھی کر رہے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بات ٹھیک ہے یا غلط۔ حسن نے کہا۔

یہ تمہاری سوچ ہے کہ ان کے قول اور فعل میں تضاد نہیں۔ ان میں جو مقتدر طبقہ ہے وہ مختلف شکلوں میں جتنا استحصال کر رہا ہے وہ میں اور تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ مولوی اپنے بیٹوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں اور میرے اور تمہارے بیٹوں کو جہاد پر بھیجتے ہیں۔ مذہب کے نام پر نوخیز نوجوانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ سلیم نے اعتماد سے کہا۔

یہ تضاد موجود ہے مانتا ہوں۔ مگر یہ تضاد ہر طبقے میں موجود ہے۔ میں دوسری جگہ کی بات نہیں کرتا، تمہاری مثال لیتے ہیں۔ تمہیں کتنا عرصہ ہوا ہے اس این جی او میں کام کرتے ہوئے۔ پانچ چھ سالوں سے زیادہ ہو رہا ہے۔ بقول تمہارے کہ تمہاری این جی او لیٹریسی (Literacy) تعلیم اور صحت پر کام کر رہی ہے۔ تم کہتے ہو کہ یہ کام بطور خدمت کر رہا ہوں، ایسا ہی ہے نا؟ حسن نے سلیم سے تصدیق مانگی۔

ہاں۔ اس میں کوئی شک ہے۔ سلیم نے کہا۔

تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟ سلیم نے پوچھا۔

پچاس ہزار سے زیادہ ہے۔ سلیم نے جواب دیا۔

تم یہ خدمت پچاس ہزار روپوں کی عوض کر رہے ہو۔ اگر خدمت کی بات چھوڑ دی جائے تو تم یہ بتا سکتے ہو کہ تمہارے گاؤں میں تمہارے گھر کے ساتھ کتنے بچے ہیں جو بے تعلیم ہیں یا پھر تم نے ان کی کتنی مدد کی ہے۔ کتنی عورتیں ہیں جو بیماری کے باعث صحت کی سہولیات نہ ہونے کی وجہ سے مر رہی ہیں۔ تم نے ان کی کتنی خدمت کی ہے۔ اس مد میں کروڑوں کے بجٹ آپ لوگوں کے پاس آتے ہیں وہ تم لوگوں کی تنخواہ، پیٹرنول اور دفاتروں پر خرچ ہوتے ہیں۔ تم جس گاڑی میں گھومتے ہو اس کے ایک دن کا خرچہ کسی غریب گھرانے کے ایک مہینے کا خرچ ہے۔ اس طرف تم لوگ کیوں دھیان نہیں دیتے۔ حسن نے کہا۔

تم تو پورے طالب ہو۔ ویسے ہی تم نے اپنے آپ سے قوم کا غمخوار بنایا ہے۔ سلیم نے معقول جواب دینے کے بجائے ذاتی وار کیا۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ جب تمہیں تمہاری خرابی کی نشاندہی کرائی گئی تو میں تمہاری نظر میں طالب بن گیا۔ اگر طالب کو اُس کی خامی بتائی جائے تو کافر بن جاتا ہوں۔ ہم اپنا نقطہ نظر اور عمل کو ہر تنقید سے بڑھ کر دیکھتے ہیں۔ اپنے گریبان میں اپنی خامیاں نہیں دیکھتے، اگر کوئی اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے تو وہ ہمارا دشمن ہے۔ بحیثیت ایک قوم کے یہ ہمارا مجموعی رویہ بن گیا ہے۔ حسن نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

ارے جگر! مغرب اتنا پاگل نہیں جو ہمیں مفت پیسے دے رہا ہے۔ نکلے نکلے کا حساب دیتے ہیں۔ سلیم نے کہا۔

میں مانتا ہوں تم حساب دیتے ہو، مگر یہ حساب صرف فائلوں اور کاغذوں تک محدود رہتا ہے۔ مغرب چاہتا بھی یہی ہے کہ ہمارے با استعداد نوجوان نسل کو اسی طرح کی سرگرمیوں میں مصروف رکھا جائے۔ اور نوجوان سمجھتے ہیں کہ ہم ایک بہت بڑا کام کر رہے ہیں۔ انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں اور قوم کو شعور دے رہے ہیں، نفع دے رہے ہیں۔ لیکن عملی طور پر دیکھا جائے تو اس کے اثرات کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ تم کہتے ہو کہ تمہارا سگا چچا زاد بھائی عرصے سے طالبان میں ہے پھر اُس کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ زندہ ہے یا پھر مر گیا۔

عبدالولی نے جلدی کان سے چادر ہٹائی تاکہ بات ٹھیک سے سُن سکے۔

اُس کے بھائی بہن، ماں باپ کس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں تم نے کوئی مدد کی ہے۔ جان پہچان ہے، اچھی پوزیشن ہے، پیسے ہیں تمہارے پاس، تمہاری اور اُن کی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ تمہاری شادی میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تمہارے چچا اور چچا زاد بھائی ایسے کام کر رہے تھے جیسے وہ تم لوگوں کے نوکر ہوں۔ تم انہیں کس نظر سے دیکھ رہے تھے۔

یہ سنتے ہی عبد الولی نے جسم میں ایک کچکی سی محسوس کی۔ اُس کا دل چاہا کہ اُنھ کر سلیم کو گریبان سے پکڑ کر ہر چیز کا حساب لے۔ کانوں میں ایک گونج سی پھیل گئی۔ تمام گھرانہ اُس کے نظروں کے سامنے آگیا۔ کچھ سوچے بغیر دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ آج سلیم کو گریبان سے پکڑوں گا اور اُن تمام چیزوں کا حساب لوں گا۔

عبد الولی جیسے ہی کھڑا ہوا ایک سراچہ گاڑی تیزی سے آئی۔ سلیم اور حسن کے قریب بریک لگائی۔ دو آدمی نقاب پہنے گاڑی سے اترے۔ ایک کے ہاتھ میں کلاشنکوف اور دوسرے کے ہاتھ میں ٹی ٹی پستول تھا۔ آنکھ جھپکتے ہی سلیم کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے۔ یہ اتنی جلدی ہوا کہ کسی کو کچھ کرنے کا کیا کچھ سوچنے تک کا موقع نہ ملا۔

حسن جلدی سے بھاگ کر میڈیکل کے اندر گیا اور ٹیلیفون کا رسیور اٹھایا، شاید وہ پولیس کو خبر کر رہا تھا۔ عبد الولی کو یہ سب خواب کی طرح لگا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ جس ارادے سے اٹھا تھا اسی طرح کھڑا رہ گیا۔ قریب کھڑے لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ یہ کیا ہوا۔ لیکن کسی نے بھی کچھ نہیں کیا اور نہ وہ کر سکتے تھے اور نہ کسی کے بس میں تھا۔

عبد الولی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ ایک دفعہ وہ نیچے چورنگی تک گیا پھر واپس ہسپتال کی طرف آیا۔ یہاں پہنچ کر وہ کچھ سنبھل گیا تھا۔ اللہ داد بھی جاگ چکا تھا۔

حافظ صاحب! خیر ہے آج مغرب کی نماز سے پہلے آگئے؟ اللہ داد نے پوچھا۔
دن دھاڑے، لوگوں کی موجودگی میں لوگ آکر آدمی کو گاڑی میں زبردستی ڈال کر لے جاتے ہیں۔ روکنے والا کوئی نہیں۔ یہ کوئی حکومت ہے جو دنیا کو بھی قبول ہے اور لوگوں کو بھی۔ وہاں کوئی ایسی حرکت کرے پتہ چل جائے گا کہ اُن کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ عبد الولی نے کہا۔

کیوں کیا ہوا، کس کو گاڑی میں ڈالا؟ اللہ داد نے پوچھا۔

مجھے کیا پتہ کون تھا۔ عبد الولی نے ٹیبل کے ساتھ پڑے گلاس کو اٹھایا اور پانی سے بھر کر پینے لگا۔ پھر اپنے پسینے پھونچنے لگا۔

دوسرے دن شام کو عبد الولی اُس میڈیکل میں گیا جہاں سلیم بیٹھا کرتا تھا۔ عبد الولی نے میڈیکل کے مالک حسن سے پوچھا۔

کل وہ شخص کون تھا جسے اٹھا کر لے گئے؟ میں یہاں چائے پی رہا تھا تو یہ سب دیکھا۔ اور کون ہیں، اغوا کار ہیں۔ تاوان کیلئے اٹھایا گیا ہے۔ اس بیچارے نے کچھ عرصے پہلے سے کچھ پیسے کمائے ہیں وہ بھی این جی او میں اور گاڑی بھی ساتھ ہے۔ اپنی بھی ایک اچھی گاڑی ہے، اسی لیے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ حسن نے جواب دیا۔

کوئی حال احوال ہے یا نہیں۔ آپ کا کیا لگتا ہے؟ عبد الولی نے پوچھا۔
ہاں اُس کے والد نے کہا کہ انہوں نے ایک کروڑ کا مطالبہ کیا ہے۔ پیسے ضرور ہیں مگر کروڑوں میں نہیں۔ حسن نے کہا۔

آپ کا کیا لگتا ہے۔ عبد الولی نے پھر پوچھا۔
میرے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔ دوست ہے میرا۔ حسن نے جواب دیا۔
اچھا، اللہ دیکھے اُن کو۔ عبد الولی نے غزدہ لہجے میں کہا۔
ہاں آئین، چھوٹے بچے ہیں اُس کے، خدا حفاظت کرے۔ حسن نے کہا۔

مجھے والی صاحب نے احوال بھیجا ہے کہ جتنی جلدی ہو سکے آجاؤ۔ میں یہاں اور نہیں ٹھہر سکتا، انشاء اللہ جیسے ہی پہنچ جائیں تو آنے کا پروگرام بنا لیتے ہیں۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ ضرور آئیں گے۔ عبدالولی نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

چلو یہی صحیح، جب تم ہی نہیں چاہتے کہ مجھے ماں کی دعائیں نصیب ہو تو پھر ٹھیک ہے میری قسمت میں نہیں کہ کسی کو ماں کہہ سکوں۔ خدا بھی مجھ سے حساب کرے گا، دامن دیا ہے مگر وہ بھی خالی۔ ہر چیز سے خالی۔ اللہ داد نے بہت ہی مایوس کن لہجے میں کہا۔

اللہ داد اخوند! اللہ داد اخوند! کہاں ناکہ واپس آجائیں گے، کیوں ایسی باتیں کرتے ہو۔ مجھ میں اور تم میں کیا فرق ہے۔ تمہارا تو کچھ نہیں لیکن میرا سب کچھ ہونے کے باوجود کچھ نہیں۔ ساری زندگی تمہارے ساتھ ایک یتیم کی طرح گزاری۔۔۔ آئیگیٹلے اگر خدا نے چاہا۔ عبدالولی نے اللہ داد کو تسلی دی۔

عبدالولی اخوند! میں نے موت کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ پتہ نہیں یہ زندگی کب تک وفا کرے گی۔ جیسے تم چاہتے ہو وہی کرو میں کچھ نہیں بولوں گا۔ اللہ داد نے اسی لہجے میں کہا۔

اگلی صبح دونوں ہسپتال کے سامنے کھڑی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ بارہ بجے وہ سپین بولدک کے اڈے پر اترے۔ محمد گل تین طالبان کے ساتھ اُن کے انتظار میں تھا۔ پھر دونوں اُس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے اور اپنی اوطاق کے طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں محمد گل نے بتایا کہ والی صاحب نے کہا ہے کہ پہلے آپ لوگوں کو اُن کی طرف لے جاؤں اُس کے بعد اپنی ذمہ داری کی طرف چلے جانا۔ انہوں نے بھی بات مان لی۔ ظہر کی نماز والی صاحب کے دفتر میں پڑھی۔ کھانا بھی وہیں کھایا۔ تہوہ چائے اُن کے سامنے رکھی گئی تھی کہ والی صاحب تشریف لائے۔

السلام علیکم! خوش آمدید اللہ داد اخوند۔ بہت خوشی ہوئی، آپ کو بہ روح صحت دیکھا۔ اللہ آپ کو صحت مبارک کرے۔

وعلیکم السلام! بہت مہربانی۔ اللہ آپ کا ایمان تازہ کرے۔ دونوں نے ایک ہی جملے میں کہا۔

والی صاحب یہ آپ کی دعاؤں کی برکت ہے کہ موت کے منہ سے نکل آیا ہوں۔ اللہ داد نے کہا۔

یہ اللہ کا فضل ہے اللہ داد اخوند۔ اللہ مجاہدین کی مدد ہر وقت ہر جگہ کرتا ہے۔ والی صاحب نے جواب دیا۔

بے شک۔ عبد الولی نے کہا۔

حافظ صاحب! آپ کیسے ہیں۔ والی صاحب نے عبد الولی سے حال احوال دریافت کیا۔ الحمد للہ میں ٹھیک ہوں۔ میرا دوست ٹھیک ہو گیا تو پھر میں تو بہت ہی ٹھیک ہوں۔ عبد الولی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

ملک کے حالت دوسری طرف جارہے ہیں، میں نے آپ لوگوں کو اس لیے بلایا کہ حالات سے باخبر کر دوں۔ یہ باتیں کھلم کھلا نہیں کہی جاسکتی۔ والی نے عبد الولی سے کہا۔ کیوں کیا ہوا؟ ہم تو اس امید پر تھے کہ بہت جلد سارا افغانستان ہمارے قبضے میں ہو گا۔ عبد الولی نے کہا۔

مگر اب ایسا لگ رہا ہے کہ قبضہ کیا ہوا افغانستان بھی ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ والی نے جواب دیا۔

وہ کیوں؟ عبد الولی تشویش میں پڑ گیا۔

امریکہ پر جو حملہ ہوا ہے، امریکہ کا کہنا ہے کہ اس حملے میں شیخ صاحب کا ہاتھ ہے۔ اُن کی مانگ ہے کہ شیخ صاحب کو اُن کے حوالے کیا جائے یا پھر جنگ کیلئے تیار ہو جائیں۔ والی صاحب نے مختصر اُن کو بتایا۔

کو نسا حملہ، یہ کیسی بات ہے؟ عبد الولی نے بے خبری میں کہا۔

حافظ صاحب! آپ بھی بادشاہ ہو۔ کسی چیز کی خبر نہیں رکھتے یہ باتیں تو پوری دنیا میں ہو رہی ہیں۔ میں آپ سے کہہ رہا تھا کہ آپ مجھ سے ہمیشہ رابطے میں رہیں گے۔ حالات بہت جلد تبدیل ہونے والے ہیں اور ہمیں حالات کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔ والی صاحب نے عبدالولی سے کہا۔

والی صاحب! یہ بات مجھے مایوس کن لگ رہی ہے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ

لوگ۔۔۔۔۔

یہ مایوسی نہیں، بہت جلد آپ سمجھ جاؤ گے۔ والی صاحب نے عبدالولی کی بات کاٹی۔
اب آپ لوگ اپنے ضلع میں جائیں، دوسرے لوگوں یا پھر اپنے ساتھیوں سے ان باتوں کا تذکرہ کرنا ضروری نہیں۔ یہ باتیں صرف آپ لوگوں تک محدود رہنی چاہیے۔ میں آپ کو قابل اعتماد شخص سمجھتا ہوں۔ والی صاحب نے یہ کہہ کر دونوں کو رخصت کیا۔

(۱۹)

عبدالولی واپس اپنے معمول کی زندگی پر آگیا۔ اب وہ ایک ریڈیو بھی ساتھ رکھنے لگا جس سے وہ خبریں سنتا اور خود کو حالات سے باخبر رکھتا۔ والی صاحب کے ساتھ بھی رابطے میں تھا۔ کبھی کبھار وائر لیس پر رابطہ کرتا۔ اللہ داد اوطاق میں تھا۔ کبھی کبھار وہ بھی ان کے ساتھ گشت پر نکل جاتا۔ لیکن زیادہ تر وقت اوطاق میں گزارتا۔ عبدالولی اگرچہ اپنے معمولات جاری رکھے ہوئے تھا لیکن حالات کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس پریشانی پر اتنی فکر نہ تھی جتنی گھر کی فکر تھی۔ سلیم کو دیکھنے کے بعد تو اور اضطراب میں مبتلا ہو چکا تھا۔ دل میں سلیم سے بدلہ لینے کی حسرت اسی طرح رہ گئی تھی۔ نیند بھی کم ہو گئی تھی۔ جب بھی سوتا وہ دو خواب اکثر دیکھتا۔

خواب میں سینے کی روشنی بالکل کم ہو گئی تھی۔ اژدھا کی خوراک بھی بڑھ گئی تھی۔ آج بھی وہ صبح گشت پر نکلا، شہر کی گلیوں میں گشت کیا۔ زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ کوئی ایسی چیز اس کی نظر سے نہیں گزری جس سے اُسے اندازہ ہو کہ وہ بُری ہے۔ لیکن ارد گرد کی فضاء غمزہ دکھائی دے رہی تھی۔ ہر شخص اُسے غمزہ دکھائی دے رہا تھا۔ اگر کوئی ہنس بھی رہا ہوتا تو اُسے لگتا کہ وہ رورہا ہے۔ ریڈیو کی خبروں سے اُسے اندازہ ہو رہا تھا۔ جس اژدھا کو وہ کئی عرصے سے خواب میں دیکھ رہا تھا حقیقت میں آہستہ آہستہ اس وطن کی طرف بڑھ رہا ہے اور وطن کے تمام بچوں کو نگل رہا ہے۔ خواب میں اُس پر اتنے گہرے اثرات مرتب کیے تھے کہ اب وہ کبھی کبھی کھلی آنکھوں اُس اژدھا کو دیکھتا۔

جب وہ واپس اوطاق کی طرف روانہ ہوا تو محمد گل نے کہا۔

حافظ صاحب! کئی دنوں سے جمعہ خان کی گلی کے ایک گھر میں کچھ مشکوک افراد نظر آرہے ہیں۔ میں نے کئی بار انہیں گھر سے نکلتے دیکھا ہے۔ خدوخال اور پکڑوں سے تو طالبان نظر آتے ہیں لیکن مجھے طالبان نہیں لگتے۔ میں نے حال احوال معلوم کیا ہے مگر انہیں کوئی نہیں پہچانتا۔

تمہیں انہی سے پوچھنا چاہیے تھا۔ اگر طالبان ہیں تو پھر وہاں کیوں رہ رہے ہیں۔
عبدالولی نے کہا۔

میں نے ان سے اس لیے پوچھ گچھ نہیں کی کہ ہو سکتا ہے وہ ضلع امیر کی طرف سے
یہاں آئے ہوں اور آپ بھی موجود نہ تھے اس لیے۔ محمد گل نے کہا۔

مجھے تو کافی دن ہوئے آیا ہوں، پھر مجھ سے کیوں نہیں کہا۔ ضلع امیر اگر کسی کو بھیجے گا تو
پہلے ہم سے بات کرے گا۔ ادارے کو اس طرح کی اطلاع نہیں آئی کہ یہ طالبان ہیں یا پھر کوئی اور
؟ عبدالولی نے پوچھا۔

نہیں ایسی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ میں ہر روز ادارے کے دفتر جاتا رہا ہوں۔ محمد گل نے
کہا۔

ٹھیک ہے عصر کی نماز کے بعد چلتے ہیں۔ تمہیں تو گھر معلوم ہے؟ عبدالولی نے محمد گل
سے پوچھا۔

ہاں گھر مجھے معلوم ہے۔ محمد گل نے جواب دیا۔

سہ پہر کو عبدالولی اللہ داد کو بھی ساتھ گشت پر لے کر نکل گیا۔ عبدالولی کے ذہن میں
حالات کی وجہ سے بہت سے شکوک پیدا ہوئے تھے۔ بہت سے ایسے لوگ پکڑے جا چکے تھے جو
طالبان کی بھیس میں آئے تھے لیکن مقصد ان کا کچھ اور تھا۔ ان لوگوں کے بارے میں جو محمد گل
نے کہا تھا پریشان تھا۔ ایسا نہ ہو جو حالات ملک میں پھیل رہے ہیں یہ لوگ بھی اُس مقصد کیلئے آئے
ہوں۔ اسی سوچ میں تمام شہر کا گشت کر لیا۔ عصر کی نماز جمعہ خان کی گلی کے قریبی مسجد میں پڑھی۔
نماز کے بعد مسجد کے باہر کچھ لوگ عبدالولی سے ملنے آئے۔

حافظ صاحب! بڑے عرصے کے بعد اس طرف آنا ہوا آپ کا۔ ادارے کی گاڑی تو
کبھی کبھار اس طرف آ جاتی ہے۔ ایک شخص نے پوچھا۔

ہاں، کچھ مصروفیات تھیں اس لیے عرصہ ہوا یہاں نہیں آیا۔ خیراب میں آگیا ہوں۔
میرے ساتھی آتے تھے تو یوں سمجھیں جیسے میں خود آ رہا تھا۔ عبد الولی نے کہا۔
ہاں یہ بات تو ٹھیک ہے۔ اسی شخص نے کہا۔
کیسے ہو، زندگی کیسی گزر رہی ہے، کوئی مسئلہ تو نہیں۔ عبد الولی نے پوچھا۔
نہیں، واللہ کوئی مسئلہ نہیں، صبح ہو جاتی ہے، پھر شام، نہ بجلی ہے نہ کوئی اور چیز، نہ کوئی
چور ہے۔ امن و امان ہے اور بس یہی زندگی ہے۔ ایک بوڑھے شخص نے کہا۔
حاجی صاحب! دو دن کی زندگی ہے گزر جائے گی، بجلی ہو یا نہ ہو۔ خدا ہماری آخرت
سلامت رکھے۔ عبد الولی نے کہا۔

پھر ساتھیوں سمیت اُن سے رخصت لی۔ جمعہ خان کی گلی میں داخل ہوئے اور سیدھا
اُس گھر کے سامنے رُکے جس کے بارے میں انہیں شک تھا کہ یہاں مشکوک لوگ طالبان کی
بھیس میں رہ رہے ہیں۔ عبد الولی اور اللہ داد گاڑی میں بیٹھے رہے۔ محمد گل اور دوسرے طالبان کو
معلومات کیلئے بھیجا۔

کچھ دیر بعد محمد گل ایک شخص کے ساتھ ان کے پاس آیا۔
حافظ صاحب! یہ ہے وہ شخص۔ یہ اپنے آپ کو طالبان کہتے ہیں۔ محمد گل نے کہا۔
کہاں سے آئے ہو؟ عبد الولی نے شخص سے پوچھا۔
ہم کوئٹہ سے آئے ہیں۔ شخص نے جواب دیا۔
کتنے آدمی ہو اور کس مقصد کیلئے آئے ہو؟ عبد الولی نے پوچھا۔
چار آدمی ہیں، ہم، طالبان کیلئے آئے ہیں۔ شخص نے جواب دیا۔
طالبان ہو یا پھر طالبان کی طرح دکھتے ہو؟ عبد الولی نے شکلی لہجے میں پوچھا۔
ہم طالبان ہیں صاحب جہاد کیلئے آئے ہیں۔ شخص نے ڈرتے ہوئے کہا۔

وہ شخص آگے بڑھا اور پھر یہ سب اُس کے پیچھے چل پڑے۔ جب کمرے میں داخل ہوئے تو وہاں دو کلاشکوف پڑے تھے۔ عبد الولی نے محمد گل سے کہا، یہ کلاشکوف اٹھاؤ۔
محمد گل نے جلدی سے کلاشکوف اٹھالیے۔
بہن جی کہاں ہے؟ عبد الولی نے شخص سے پوچھا۔
وہ دوسرے کمرے میں ہے۔ شخص نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔
عبد الولی کو اب یقین ہو گیا کہ یہ لوگ کسی اور مقصد کیلئے آئے ہیں۔ دوسرے کمرے کی طرف گیا۔ وہاں کوئی ایسا بیٹھا تھا جیسے باندھا گیا ہو۔ چادر اُس پر ڈالی گئی تھی۔
یہ تمھاری بہن ہے؟ عبد الولی نے پوچھا۔
شخص نے جواب دینے کی بجائے اپنا سر نیچے کیا۔
جاؤ یہ چادر ہٹا دو۔ عبد الولی نے دوسرے طالب سے کہا۔
جب اُس نے چادر ہٹائی تو ایک شخص بڑے بال ہاتھ، پاؤں باندھے بیٹھا تھا۔ عبد الولی نے جب اُسے دیکھا تو کہا۔
یہ تو آدمی ہے کون ہے یہ؟ ہاتھ پاؤں کھول کر باہر صحن میں لے آؤ۔ عبد الولی یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔
ان سب کے ہاتھ باندھ کر گاڑی میں بٹھا دو اور اوطاق لے چلو۔ عبد الولی نے طالبان کو حکم دیا۔
وہ شخص جس کے ہاتھ پاؤں باندھے گئے تھے جب باہر لایا گیا اور عبد الولی نے اُسے غور سے دیکھا تو ایک جست لگائی
تم؟
وہ شخص حیران ہوا کہ یہ کون ہے جو مجھے جانتا ہے۔ تھوڑا آگے ہوا

مولوی صاحب! ان لوگوں نے مجھے کہیں دن ہوئے ہیں کہ انخو کیا ہے اور مجھے پتہ نہیں کہ میں کہاں ہوں؟ مغوی شخص نے عبد الولی سے کہا۔
تم سلیم ہو، لعل محمد کے بیٹے؟ عبد الولی نے پوچھا۔
ہاں، ہاں میں سلیم ہوں۔ آپ مجھے جانتے ہیں؟ سلیم کی آنکھوں میں امید کی کرن چمکی۔

ہاں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ عبد الولی نے جواب دیا۔
آپ کون ہو، میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟ سلیم کچھ اور قریب ہو۔
پہچان جاؤ گے۔ چلو۔ سب گاڑی کی طرف روانہ ہوئے۔ جب گاڑی میں بیٹھ گئے تو طالبان نے سلیم کو بھی پیچھے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ عبد الولی اور اللہ داد اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔
کون ہے یہ شخص؟ اللہ داد نے عبد الولی سے پوچھا۔
عبد الولی کے چہرے پر خوشی نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے اُس کے ہاتھوں خزانہ لگ گیا ہو۔

یہ میرا چچا زاد سلیم ہے۔ عبد الولی ہنس پڑا۔
تمہارا چچا زاد سلیم؟ اللہ داد نے حیرانی سے پوچھا۔
ہاں۔ تمہیں یاد ہے ہسپتال میں میں نے تم سے کہا تھا کہ دن دھاڑے لوگ انخو کیے جاتے ہیں؟ عبد الولی نے اللہ داد کی طرف دیکھا۔
ہاں تم نے کہا تھا۔ اللہ داد نے کہا۔
اُس دن اس سلیم ہی کو لوگ لے گئے، جسے آج خدا نے میرے سپرد کیا۔ میں اسے آسمان پر ڈھونڈ رہا تھا اور خدا نے اسے مجھے زمین پر ملایا۔ عبد الولی نے کہا۔
مگر اُس نے تمہیں پہچانا اور تم نے پہچان لیا؟ اللہ داد نے پوچھا۔

میں نے تو اسے کونسلہ میں ہی پہچان لیا تھا۔ مونچھ اور داڑھی صاف تھی میں نے اس کی باتیں بھی سنیں ہیں لیکن یہ مجھے نہیں پہچانتا۔ میری اتنی لمبی داڑھی جو ہے اس لیے نہیں پہچان سکا۔ میری داڑھی مونچھ نہیں آئے تھے جب ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ عبدالولی نے کہا۔
تو پھر تم نے کیسے پہچانا؟ اللہ داد نے پھر پوچھا۔

اس نے رنگ نہیں بدلا اور پھر اس کی داڑھی اور مونچھ بھی نہیں تھے۔ تھوڑا موٹا ہوا ہے۔ اگر داڑھی ہوتی تو شاید میں بھی نہ پہچان سکتا۔ عبدالولی نے کہا۔

اوطاق جب پہنچے تو اُن چاروں آدمیوں کو ضلع دفتر کے محکمے بھیجا گیا۔ سلیم کو اوطاق میں رکھا۔ عشاء کی نماز اور کھانے کے بعد عبدالولی اور اللہ داد جب اپنے کمرے میں آئے تو اللہ داد نے عبدالولی سے کہا۔

تم نے سلیم کو اپنا آپ کیوں متعارف نہیں کروایا؟
متعارف کروادو، بہت جلد کروادو، اللہ داد نے کہا۔ عبدالولی کی آنکھوں میں چمک سی آئی۔
میں تو کہتا ہوں ابھی یہاں بلو اور اُسے تسلی دو کہ خدا سب خیر کرے گا۔ اللہ داد نے عبدالولی کو مشورہ دیا۔

وہ تو بہت بڑا آدمی ہے، بڑے آدمی کا بیٹا ہے، ہوشیار اور دانا ہے، وہ ہم جیسے جاہلوں کے ساتھ کیسے اس کمرے میں رہ سکتا ہے۔ اُس کے لیے ہمیں کوئی اور بندوبست کرنا ہوگا۔ عبدالولی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

دیکھو! وہ اب تمہارے رحم و کرم پر ہے۔ ایسا کوئی کام نہ کرنا جس سے بدنامی ہو۔ اللہ داد عبدالولی کے ارادے کو بھانپ گیا اس لیے نیک مشورہ دیا۔

میں اسے عبرت کا نشان بنا دوں گا۔ عبدالولی کمرے میں گھومنے لگا۔
تھیں یہ حق حاصل نہیں جو اُسے سزا دو۔ اللہ داد نے کہا۔

تم اس معاملے میں دخل نہیں دو گے۔ ایسا نہ ہو کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔ عبد الولی نے ایسے لہجے میں کہا کہ اللہ داد ڈر گیا۔ عبد الولی اپنے کمرے سے نکل کر وہاں گیا جہاں سلیم دوسرے طالبان کے ساتھ بیٹھا تھا۔

تم لوگ اس شخص کو اُس کمرے میں لے جاؤ۔ عبد الولی نے اُس کمرے کی طرف اشارہ کیا جہاں پہلے کوئی نہیں گیا تھا۔

حافظ صاحب! وہ کمرہ تو بہت خراب ہے۔ عرصہ ہوا کہ صفائی بھی نہیں ہوئی اور نہ کچھ اُس میں بچھا ہے۔ ایک طالب نے کہا۔

اب ہم اس کیلئے بگلہ کہاں سے لائیں۔ یہ چٹائی اٹھاؤ اور وہاں بچھا دو اور ایک تکیہ بھی دے دو۔ عبد الولی نے طالب سے کہا۔

اور ہاں تمہیں چاہیے کہ کسی چیز کی کوشش نہ کرو، میرا مطلب یہاں سے بھاگنے کی۔ عبد الولی نے سلیم سے کہا۔

حافظ صاحب! میں کیوں بھاگنے کی کوشش کرونگا۔ اگر بھاگ بھی جاؤں تو راستے کا پتہ نہیں۔ سلیم نے بڑی عاجزی سے کہا۔

عبد الولی کو سلیم کی عاجزی اور اُس کے مُنہ سے حافظ صاحب کا لفظ سننے پر ایک فخر سا محسوس ہوا۔

ہاں اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ عبد الولی یہ کہتے ہی واپس اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ اپنے بستر پر لیٹ گیا، کلاشکوف جو پہلے دور رکھتا اب اپنے تکیے کے نزدیک رکھی۔ پیٹھ کے بل لیٹ کر چھت کو بخور دیکھنے لگا۔ خیالوں میں اُس کا بچپن اُس کے سامنے ایک قلم کی طرح گزرنے لگا۔

اُس کا باپ اور سلیم کا باپ۔ اپنی ماں کے کپڑے اور سلیم کی ماں کے کپڑے۔ اپنے گھر کی نحوست اور سلیم کے گھر کی ہستی۔ وہ دن اُس کے ذہن میں ایسے تازہ ہوئے جیسے کل ہی کی بات

ہو۔ اُس دن اُس کی بہن گل پاڑا پیدا ہوئی تھی۔ ماں نے پورا دن کچھ نہیں کھایا تھا۔ پھر بچے کی پیدائش کی وجہ سے کمزور پڑ گئی تھی۔ کمزوری کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ گاؤں کی بوڑھی عورتیں جو کہ بچے کی پیدائش کیلئے آئیں تھیں نے پہلوان سے کہا۔

پہلوان! خال دارہ بہت کمزور ہے، اگر کہیں سے دیسی گھی کا بندوبست ہو جائے تو میں اُس سے اُس کیلئے لیٹی بنا لوں گی اور اسے کھلا لوں گی تاکہ دل کو تقویت ملے۔ اگر کہیں سے مرغی کا بندوبست ہو جائے تو یہ بہت اچھا ہو گا، اُس کیلئے بیخنی بھی بنالیں گے۔

پہلوان نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کے بس میں کچھ نہیں تھا۔ پھر عبد الولی سے کہا۔
ولی بیٹا تم وہ پیالہ اٹھاؤ لعل محمد کے گھر چلے ہیں ہو سکتا ہے وہاں سے کچھ گھی مل جائے۔
گائے کو تو تین مہینے ہوئے کہ اُس نے بچہ جنا ہے۔

عبد الولی نے بھی پیالہ اٹھایا اور اُس کے ساتھ چل پڑا۔ جب بھائی کے گھر پہنچا تو بھائی اور بھابھی کے سامنے پلیٹ میں پتہ اور بادام پڑا تھا۔ دودھ پتی چائے سے کپ بھرے پڑے تھے۔ سلیم اپنے بھائی او بہنوں کے ساتھ کھیل میں مشغول تھا۔ پہلوان لعل محمد سے کچھ سال بڑا بھی تھا۔ اس کے باوجود لعل محمد نے پیٹھے پیٹھے پہلوان کو سلام کیا پھر اپنی بیوی سے کہا
رات کو اُن مرغوں کے پیس بنا لو مہمان آئیں گے۔ اور وہ دیسی گھی میرے ایک دوست کو بہت پسند ہے اُس کے لیے تیار رکھو تاکہ اُسے دے سکوں۔

تم تو بہت ہی پریشان حال شخص ہو، میں نے سب کچھ کیا ہے تم اپنی چائے پی لو۔ بیوی نے کہا۔

پہلوان لالا! آپ کیسے آئے تھے۔ میرے خیال سے آج مزدوری پر نہیں گئے تھے۔
لعل محمد نے پہلوان سے پوچھا۔

آج میں نے سارا دن گھر پر گزارا، ولی کی ماں بیمار تھی، دوپہر کو میری بیٹی پیدا ہوئی۔۔۔۔۔

پہلو ان لالا! سلیم کی ماں ٹھیک کہتی ہے، آپ بھی تو وقت بے وقت آجاتے ہو، کوئی نہ کوئی چیز چاہیے ہوتی ہے۔ جب کام کا وقت آتا ہے تو پھر غائب ہو جاتے ہو۔ لعل محمد نے اپنے بھائی سے کہا۔

اسی اثناء سلیم بھی آگیا۔ پھر کیا مانگنے آئے ہو۔ سلیم نے عبد الولی سے کہا۔

میری ماں بیمار ہے، گھی مانگنے آئے ہیں۔ عبد الولی نے کہا۔

تمھاری بھی ماں ہے، ہر وقت بیمار رہتی ہے اچھا ہے کہ مر جائے۔ اس ماں سے تو نہ ہی ہو اچھا ہے۔ سلیم نے کہا۔

تمھاری ماں مر جائے۔ عبد الولی نے جواب دیا۔

سلیم نے عبد الولی کو ایک زور کا تھپڑ مارا۔ تم میری ماں کو مارو گے۔ پھر اُسے دھکا دیا۔ عبد الولی کے ہاتھوں سے پیالہ گر کر ٹوٹ گیا۔ لعل محمد غصے سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک زور دار تھپڑ عبد الولی کے گردن پر دے مارا۔

اُٹھاؤ یہ گند، ایک تو بھیک مانگتے ہو اور پھر اوپر سے بات بھی بُری لگتی ہے۔ اور آپ --- لعل محمد پہلو ان کی طرف متوجہ ہوا۔ بس بچوں کے پیدا کرنے کے پہلو ان ہو۔ کھانے کو تو کچھ دے نہیں سکتے۔ جیسے آپ ہیں ویسے بچے بھی جاہل ہیں۔ جیسا باپ ویسی اولاد۔

عبد الولی اپنے بستر پر بیٹھ گیا، کلاشکوف کو دیکھا، پھر اللہ داد کی طرف دیکھا، اُس کی آنکھیں بند تھیں، عبد الولی نے کلاشکوف اُٹھائی، اُس کمرے کی طرف گیا جہاں سلیم سویا تھا، عبد الولی نے دروازہ کھولا، سلیم چٹائی پر سر گٹھنوں میں دیے سو رہا تھا۔ اُس کا چہرہ دروازے کی طرف تھا، دوسری طرف کھڑکی میں چراغ جل رہا تھا جس کی پہلی روشنی سلیم کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

عبدالولی نے جب سلیم کے چہرے کی طرف دیکھا تو سارا غصہ اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔ آنکھوں کے راستے سلیم کے چہرے پر نفرت بھری نظر پڑی، کلاشکوف کی نئی سلیم کی طرف کی۔

آج میں یہ ساری گولیاں تمہارے خوبصورت دماغ میں ڈالوں گا، جس دماغ پر تم ناز کرتے تھے اور کرتے ہو۔ نہیں، نہیں، اتنی آسان موت کہاں دوں گا۔ عبدالولی اپنے آپ سے دھیمی آواز میں مخاطب تھا۔

ایسی سزا دوں گا جس سے موت بھی پناہ مانگے گا۔ اور تمہاری ماں تمہاری زندگی کی نہیں تمہاری موت کی دعائیں مانگے گی۔ جس کی خاطر تم نے مجھے ساری زندگی ضلالت کے کنویں میں دھکیل دیا۔ عبدالولی نے کلاشکوف کو ہاتھ میں مضبوطی سے گھومایا تو کلاشکوف سے آواز ابھری۔

کک، کک، کون ہے، میں نے کچھ نہیں کیا۔ سلیم ڈرتے ہوئے نیند سے اٹھا۔

کک کون ہو؟ سلیم چٹائی پر بیٹھ گیا۔

سو جاؤ دوسروں کو جگا دو گے۔ عبدالولی نے اُسے پاؤں سے دھکیلا۔

سلیم پیٹھ کے بل چٹائی پر گر گیا۔

میں نے کیا کیا ہے۔ سلیم کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور یہ کون ہے۔ ابھی تک نیند اور خوف کے اثر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ عبدالولی واپس نکل آیا اور دروازہ بند کر دیا۔ اپنے کمرے میں گیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوچ کر گئی تھی۔ مختلف سوچوں میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ صبح کی آذان کے ساتھ آنکھ لگ گئی۔ خواب دیکھ رہا تھا۔ خواب میں زر قا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چھوٹی زر قا جو اس کیلئے چیزیں لاتی تھی اگرچہ زر قا اسی طرح چھوٹی مگر وہ باتیں اس طرح کر رہی تھی جیسے بڑی عورت۔ خواب میں زر قا اُس سے التجا کرتی ہے۔

عبدالولی! میرے سر سے دو پیٹھ مت چھینو۔ دیکھو میری حیا مجھ سے مت لو۔ یہ دو پیٹھ

میرا سب کچھ ہے۔

بس اس دوپٹے کی بات کرتی ہو؟ وہ اُسے دلا سہ دیتا ہے ہے لیکن وہ صرف یہی التجا کرتی۔ خواب میں جب زر قا اُس کا ہاتھ پکڑتی ہے تو وہ جاگ جاتا ہے۔ عبدالولی کی جب آنکھ کھلی تو وہ حیران تھا کہ زر قا اُس کے خواب میں کیسے آئی۔ کچھ وقت کیلئے سوچوں میں پڑا۔ پھر نماز کیلئے اُٹھا۔ نماز کے بعد جب ریڈیو لگا یا تو ریڈیو میں خبریں شروع تھیں کہ امریکہ اور دوسرے ممالک نے افغانستان پر حملہ کر دیا۔ والی صاحب سے رابطے پر معلوم ہوا تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کر دی۔

(۲۰)

عبدالولی معمول کے مطابق صبح اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گاڑی میں گشت پر نکلا۔ شہر میں حالات معمول پر تھے لیکن خاموشی چھائی تھی۔ جب دوپہر کو واپس اپنے اوطاق کھانا کھانے آئے تو سلیم کو اپنے کمرے میں بلا یا۔ سلیم جس کی داڑھی بڑھ چکی تھی ڈرا ہوا اُس کے کمرے میں آیا۔

یہاں بیٹھو! عبدالولی نے ٹنڈ لہجے میں کہا۔

بیٹھنے کے بعد عبدالولی نے پوچھا۔

کیا کام کرتے ہو؟

کوئٹہ میں ایک تنظیم ہے اُس کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ سلیم نے پوری بات چھپائی۔ کس طرح کی تنظیم؟ سرکاری نوکری ہے یا پھر غیر سرکاری کام کر رہے ہو (عبدالولی نے وہ بات چھپائی جو اُن چاروں آدمیوں نے محکمے کے دفتر میں کی تھی کہ یہ این جی اوز کا آدمی ہے اور طالبان کے پیچھے غلط بیانی کرتا ہے۔ اسے اس لیے یہاں اٹھالائے ہیں، پیسوں کی لالچ میں نہیں لائے ہیں)

سلیم کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ وہ اس لیے اگر سچ بولے بھی تو جان نہیں چھوئے گی اور اگر جھوٹ بولے بھی تو نہیں۔ اسی سوچ میں تھا کہ کیا کہوں کہ عبدالولی نے پھر پوچھا۔

کن سوچوں میں پڑ گئے میں نے کیا پوچھا؟

ہاں، ہاں، نہیں، نہیں، سرکاری نہیں ہے۔ سلیم اپنی باتوں میں الجھ گیا۔

صحیح بات بتاؤ، یہ کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہو۔ عبدالولی نے غصے سے کہا۔

حافظ صاحب! این جی او میں ہوں، غیر سرکاری ادارہ ہے۔ سلیم نے سچ کہا۔

ہاں، تم سے اسی چیز کی توقع تھی۔ عبدالولی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

میں سمجھا نہیں حافظ صاحب!۔ سلیم کے سچ بولنے سے حواس اپنی جگہ پر آ گئے۔

سمجھا دوں گا چچا زاد۔ تم اتنے بھولے بھی نہیں جو اس بات کو نہیں سمجھے۔ مجھ جیسا جاہل اگر یہ کہے تو کوئی گلہ نہیں، تم تو قابل شخص ہو تم کیسے نہیں سمجھے۔ عبد الولی نے کہا۔

سلیم حیران تھا کہ یہ کیسی پہیلیاں بوجھ رہا ہے۔ بس نفی میں سر ہلا دیا۔

زبان کیوں گو گئی ہو گئی، جواب دو۔ سانڈ کی طرح سر مت ہلاؤ۔

حافظ صاحب! سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہوں؟ سلیم نے بڑی بے بسی میں کہا۔

بے بسی بہت بڑی بلا ہے سلیم خان۔ انسان سے عقل و دانش سب کچھ چھین لیتی ہے۔ عبد الولی نے سلیم کو اپنے نام سے پکارتے ہوئے کہا۔

سلیم حیران تھا کہ میں نے تو اسے نام نہیں بتایا تو پھر اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا۔

چچا کے بیٹے! پریشان نہ ہو۔ زندگی امتحان کا نام ہے، جو بھی بویا ہے اُسے کاٹنا پڑے گا۔

عبد الولی اٹھ کر سلیم کے پیچھے کھڑا ہوا۔

سلیم اپنے ذہنی پریشانی کے سبب عبد الولی کے اشاروں کو سمجھ نہیں پارہا تھا کہ کبھی چچا زاد تو کبھی چچا کا بیٹا کیوں کہہ کر پکار رہا ہے۔

حافظ صاحب! میں اپنے اپنے لیے پریشان نہیں ہوں، میں تو گھر کیلئے پریشان ہوں۔

ماں، باپ، بچے کس حال میں ہوں گے۔ وہ میرے لیے بہت پریشان ہوں گے۔ سلیم نے عبد الولی کی باتوں کے جواب میں اپنی پریشانی ظاہر کر دی۔

میرے ماں باپ بھی اسی طرح پریشان ہوئے تھے۔ اب بھی پریشان ہوں گے۔ اچھا ہے کہ اس درد سے مانوس ہو جاؤ۔ تم بھی اور تمہارے ماں باپ بھی۔ تم مجھے جانتے ہو کہ میں کون ہوں؟ عبد الولی نے اپنے آپ کو متعارف کرانے کا فیصلہ کیا۔

نہیں، نہیں جانتا۔ سلیم نے جواب دیا۔

میں تمہارا چچا زاد دوسروں کے ٹکڑوں پر پلا ہوا اولی ہوں۔ پہلوان چچا کا بیٹا اولی ہوں۔

عبد الولی نے اپنے سینے پر انگلی رکھی۔

عبدالولی؟ سلیم نے ایسے کہا جیسے نیند میں ہو۔
عبدالولی نہیں، ولی۔ وہ ولی جسے تم اپنی خاطر میں بھی نہیں لاتے تھے۔ جسے ہر وقت تم
نے کم اور چٹلی سطح کی نظر سے دیکھا۔ عبدالولی نے تلخ جواب دیا۔
عبدالولی تم؟ سلیم اٹھ کھڑا ہوا۔

تمہارا تو حال احوال تک نہیں تھا۔ ناہی زندگی کا اور نہ ہی موت کا۔ سلیم نے انہوں کی
طرح پوچھا۔

تم تو بہت خوش ہوئے ہو گے کہ ایک جاہل غائب ہو گیا۔ جان چھوٹ گئی۔ عبدالولی
نے اسی لہجے میں کہا۔

عبدالولی تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارا دشمن ہوں یا تم
میرے دشمن ہو۔ سلیم نے کہا۔

دشمن تو پھر بھی اچھا ہوتا ہے معلوم تو ہوتا ہے۔ تم تو وہ ہو جسے لوگ میرا اپنا کہتے ہیں
مگر تم نے انہوں کی لباس میں میرے ساتھ وہ کیا ہے جو دشمن بھی دشمن سے ناکرے۔ عبدالولی
نے کہا۔

میں نے تمہارے ساتھ کیا دشمنی کی ہے۔ ہم نے تو بیس سال سے ایک دوسرے کو
دیکھا تک نہیں۔

میں تمہاری وجہ سے بے گھر ہوا۔ بھول گئے یا حافظہ کمزور ہو گیا کیا۔ لیکن میں ابھی تک
نہیں بھولا۔ عبدالولی نے کہا۔

تم نے بچپن کی باتیں دل میں رکھی ہیں، وہ تو بچپنا تھا، کم عقلی تھی۔ ضرور ہم ایک
دوسرے سے لڑے ہو گئے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں تمہارا دشمن ہوں۔ سلیم نے جواب دیا۔
مانتا ہوں تم بچے تھے۔ تمہارے ماں باپ تو بچے نہیں تھے، وہ تو بے وقوف نہ تھے۔

عبدالولی نے کہا۔

کیوں انہوں نے کیا گناہ کیا ہے؟ سلیم نے پوچھا۔

ام، گناہ۔ غلامی کا طوق کسی کے گلے میں ڈالنا گناہ نہیں۔ ہر جگہ، ہر کسی کے سامنے کسی کی بے عزتی کرنا گناہ نہیں، غلام کی نظروں سے دیکھنا گناہ نہیں، ہماری بے بسی کا تم لوگوں کی دولت کے نیچے دب جانا گناہ نہیں۔ آخر تم گناہ کہتے کس چیز کو ہے؟ عبد الولیٰ جذباتی ہوا۔

میرا گناہ یہ ہے کہ میں پہلوان کے گھر پیدا ہوا۔ اور پہلوان کا گناہ یہ تھا کہ وہ صرف غریب تھا۔ دو ہاتھوں کی مزدوری سے گزارا کرتا تھا۔ تمہاری خوش قسمتی یہ ہے کہ تم لعل محمد کے گھر پیدا ہوئے۔ اگرچہ لعل محمد اور پہلوان ایک باپ کے بیٹے تھے لیکن معاشرے کی نظر میں ایک بے عزت اور دوسرا عزت دار تھا۔ پہلوان کے بچے جاہل اور کسی بھی چیز کا حق نہیں رکھتے، اور لعل محمد کے بچے سمجھدار اور ہر چیز کا حق رکھتے تھے۔ پہلوان کے بچے محرومی کی زندگی گزاریں جیسے میں، اور تم لوگوں کے حصے میں سب کچھ ہو۔ سمجھ، علم، دانائی یہ سب کچھ تم لوگوں کے پاس ہو اور ہمارے پاس، جہالت اور اندھیرا۔ ہم تو اللہ تعالیٰ کی وہ مخلوق ہیں جن کے حصے میں محبت تک نہیں۔ کبھی کسی نے ہم سے محبت نہیں کی۔ ہمیشہ نفرت کے کوڑے برسائے گئے اُس سے کون محبت کرے گا۔ ہم سے تو خدا نے بھی محبت نہیں کی۔ تم لوگوں کو سب کچھ دیا اور ہمیں طالبان بنایا۔ طالبان اس معاشرے کا وہ کردار ہے جو محرومی کا دوسرا نام ہے۔ طالب تو بس طالب ہے، ساری زندگی طلب میں گزارتا ہے۔ کبھی کھانے کی طلب، کبھی علم کی طلب۔ تم جیسے اپنے ہمیں ماں باپ کی شفقت سے دُور کر دیتے ہیں۔ نہ کسی نے پیار سے پکارا ہے اور نہ ہی بٹھایا ہے۔ عبد الولیٰ کی آنکھوں میں آنسو آگئے، اُس کی آواز رونے جیسی ہو گئی۔

یہ لوگ، ہمارے معاشرے کے لوگ، ہر کوئی طالب کو اس لیے عزت دیتا ہے کیونکہ اسے ثواب سمجھا جاتا ہے۔ کھانا خیرات کا دیتے ہیں، پیسے زکوٰۃ کے دیتے ہیں۔ تم جیسے مالدار لوگوں کے ہاں جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اُس کے کان میں آذان دیتے ہیں۔ یا پھر مالدار گھرانے کے کسی مردے کے ایصالِ ثواب کیلئے قرآن ختم کرتا ہے۔ اس معاشرے نے ہمیں بس یہی کچھ

دیا ہے۔ بچپن میں کھیلنے کا حق چھینا ہے، پیار کا حق چھینا، اپنے گھر اور اپنوں کے ساتھ رہنے کا حق چھینا۔ پھر کیوں لوگ ہم سے محبت کی توقع کرتے ہیں؟ عبدالولی کے لاشعور میں چھپی محرومیاں جذبات کے سیلاب کے ساتھ ابھر آئیں کہ عبدالولی خود بھی سمجھ نہیں پایا۔

عبدالولی! تمہیں پتہ ہے اس وقت تمہارے ہاتھوں میں کتنی طاقت ہے۔ تم یہاں بہت سی چیزوں پر قدرت رکھتے ہو۔ نفرت کی جگہ محبت کی آبیاری کرو۔ اس علاقے میں جہاں تک تمہاری دسترس ہے محبت کی بیج بودو۔ وہ بیج جو حضرت محمد ﷺ نے مدینہ میں بویا تھا۔ جس بیج کی بدولت عورت کو عظمت کا مقام حاصل ہوا۔ کنیز ماں بن گئی، بیوی بن گئی، بہن بن گئی اور محبت کی علامت بن گئی۔ سلیم نے ایک بڑے عالم کی طرح بات کی کہ اپنے آپ کو اچھا دکھائے اور ہمدردی حاصل کرے۔

بس، بس۔ یہ باتیں کتابوں میں اچھی لگتی ہیں۔ عبدالولی نے اپنے چچا زاد بھائی کی بات

کاٹی۔

حقیقت کی زندگی کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں، تمہیں آج محبت کے بیج کی یاد آئی۔ محمد ﷺ کا عمل یاد آیا جب میرے ہاتھ میں طاقت ہے۔ اُس وقت یہ محبت کہاں تھی جس وقت تمہارے گھر سے سوکھی روٹی کا نوالہ تک نہ دیا جاتا۔ تم صاف کپڑے پہن کر گاڑی میں سکول جاتے اور میرے پاس عید کے بھی کپڑے نہیں تھے۔ اس محبت کی تعلیم جن لوگوں نے تمہیں دی ہے وہ اُس وقت کہاں تھے۔ اُس وقت کو چھوڑو آج بھی ہمارے گاؤں میں میری ماں اور بہن تم لوگوں کے کپڑے دھوتی ہو گئی۔ میرے بھائی آج بھی پہلوان کے حرام زادے ہو گئے۔ تم اور تمہارا بھائی لعل محمد کے اچھے بیٹے۔ یہ فرق کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ اور تم جیسے این جی اوز کے تیار کردہ یہ کام کرتے ہیں۔ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ۔ خود کو افلاطون سمجھتے ہیں اور ہمیں جاہل۔ اسی اثناء میں اللہ داد بھی کرے میں داخل ہوا۔

خیر ہے کیا کہہ رہے ہو ایک دوسرے سے۔ اللہ داد نے عبدالولی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

کچھ نہیں اس افلاطون کی باتیں سن رہا ہوں۔ عبد الولی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔
 تم کیسے ہو میرے بھائی۔ کچھ دماغ ٹھکانے آ گیا۔ اللہ داد نے سلیم سے پوچھا۔
 ٹھیک ہوں مولوی صاحب۔ عبد الولی میرا چچا زاد بھائی ہے۔ سلیم نے پُر امید لہجے میں کہا۔
 یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اللہ داد نے جواب دیا۔
 گھر کا حال احوال دیا کہ نہیں؟ اللہ داد نے سلیم سے پوچھا۔
 اس نے گھر کا حال نہیں پوچھا۔ سلیم نے عبد الولی کی طرف اشارہ کیا۔
 یار تم تو پتھر دل ہو، گھر کا حال بھی نہیں پوچھا۔ اللہ داد نے عبد الولی سے کہا۔
 کس سے پوچھوں، اس سے۔ عبد الولی نے سلیم کی طرف اشارہ کیا۔
 اسے میرے گھر کا حال احوال کیا معلوم۔ اللہ داد اخوند! یہ اتنا خود غرض ہے کہ اپنے
 سوا کسی دوسرے کا حال تک نہیں پوچھتا۔ عبد الولی نے کہا۔
 تم اس کی باتوں کو چھوڑ مجھے بتاؤ کہ حافظ صاحب کے ماں باپ، بہن بھائی کیسے ہیں۔
 اللہ داد نے سلیم سے پوچھا۔
 سب ٹھیک ہیں۔ بھائیوں نے شادی کی، بہنوں کی بھی شادی ہو گئی۔ چھوٹی بہن کی
 شادی پچھلے ماہ ہوئی۔ سلیم نے جواب دیا۔
 کیا، کیا کہا؟ گل پانزا کی شادی ہو گئی۔ عبد الولی سب کچھ بھول کر سلیم کے سامنے بیٹھ
 گیا۔
 ہاں شادی ہو گئی۔ لوگ کہہ رہے تھے کہ تمہارے لیے بہت رور ہی تھی، تمہیں یاد کر
 رہی تھی۔ کہ میرا طالب لالا نہیں ہے، میری مانگ کون نکالے گا۔ سلیم نے کہا۔
 پھر کیا ہوا؟ عبد الولی نے بچے کی طرح پوچھا۔
 پھر زر قانے کہا کہ جیسے گھر میں شادی نہیں فونگی ہو گئی ہو۔ گل پانزا کی شادی نہیں بلکہ
 گھر سے جنازہ نکل رہا ہو۔ سلیم نے جواب دیا۔

اس بات نے عبد الولی کے دل میں طوفان سا برپا کر دیا، وہ تمام احساسات اور جذبات کا نپٹے لگے جو وقت اور حالات کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ دل چاہ رہا تھا کہ اُس کے پر نکل آئیں اور وہ اُڑ کر گھر پہنچ جائے۔ کھڑا ہو کر کمرے میں چکر لگانے لگا پھر تھوڑی دیر بعد کچھ سوچنے کے بعد آیا اور کہا۔

تم شادی پر گئے تھے؟ عبد الولی نے سلیم سے پوچھا۔

نہیں، میں اُس دن اسلام آباد گیا تھا۔ سلیم نے جواب دیا۔

تو پھر یہ تم سے کس نے کہا؟ عبد الولی نے پھر پوچھا۔

زرقا، میری بیوی نے۔ سلیم نے جواب دیا۔

زرقا، تمہاری بیوی۔ عبد الولی سوچنے لگا۔ پھر پوچھا۔

تم نے شادی کہاں کی؟

ساتھ والے گاؤں ملک صالح کی بیٹی سے شادی کی۔ سلیم نے جواب دیا۔

عبد الولی کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کی دل کی رگیں کاٹی ہوں۔ چکر لگاتے

لگاتے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اللہ داد اور سلیم کو کمرے میں چھوڑ دیا۔

(۲۱)

ملک کے حالات اس سطح پر پہنچے تھے کہ طالبان کو ہر جگہ مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ امریکہ اور اتحادی ممالک کے حملوں میں شدت آگئی تھی۔ کابل اور بہت سے دوسرے علاقے طالبان کے قبضے سے نکل چکے تھے۔ بہت سے طالبان صوبہ قندھار میں اکٹھے ہو گئے تھے قریب تھا کہ پورا ملک طالبان کے کنٹرول سے نکل جائے۔ یہ سب اتنا جلدی ہوا کہ بجائے چند بڑے طالبان کے باقی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسے اور کیوں ہوا۔ وہ دھاگہ کیسے ٹوٹا جس سے یہ پروئے گئے تھے۔ تمام رابطے ایسے منقطع ہوئے جیسے تھے ہی نہیں۔ شاید وہ قوت پیچھے ہٹ گئی جس نے رابطے کی کڑیاں برقرار رکھی تھیں۔ ان چند بڑے لوگوں میں جنہیں یہ سب کچھ پتہ تھا ایک عبد الولی کے صوبے کا والی صاحب تھا۔ ان حالات میں والی صاحب نے عبد الولی کو بلا بھیجا اور اپنی بات اُس سے یوں کہی۔

حافظ صاحب! حالات ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے اب سارا ملک ہمارے کنٹرول سے نکل جائے گا۔ ہم بہت دیر تک مدافعت نہیں کر سکیں گے۔ ہماری اُن تمام جگہوں کی نشاندہی ہو چکی ہے یا پھر تباہ کر دیے گئے ہیں جن سے ہم بڑے ہوئے تھے۔ تمام رابطے منقطع ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں چاہیے کہ ہم ایک فیصلہ کریں۔ تمہیں بلایا بھی اسی لیے ہے کیونکہ تم میرے خاص لوگوں میں سے ہو۔ والی صاحب نے عبد الولی سے کہا۔

شکر یہ والی صاحب! یہ آپ کی محبت ہے جو مجھے اس قابل سمجھا۔ آپ کے خیال میں کیا کرنا چاہیے؟ عبد الولی نے پوچھا۔

میں نے صوبے کے اُن تمام لوگوں سے جو ذمہ دار اور قابل اعتبار ہیں سے بات کر لی ہے۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم خود کو کچھ عرصے کیلئے کہیں روپوش کر دیں۔ والی صاحب نے جواب دیا۔

کیسے اپنے آپ کو روپوش کر دیں؟ میں کچھ سمجھا نہیں والی صاحب۔ عبدالولی نے وضاحت مانگی۔

بجائے اس کے کہ ہم لڑیں ہمیں جگہ چھوڑنی ہوگی۔ والی صاحب نے جواب دیا۔ آپ کا مطلب ہے کہ ان کافروں کو ملک حوالے کیا جائے، ان کے خلاف جہاد نہ کریں۔ عبدالولی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

اُن کے ساتھ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، وہ آسمان پر ہیں اور ہم زمین پر۔ وہ ہمیں زمین پر مار سکتے ہیں مگر ہم انہیں آسمان پر نہیں مار سکتے اور نہ ہی ان حالات میں کوئی ہماری مدد کرنے کو تیار ہے۔ والی صاحب نے جواب دیا۔

ہم نے کب کسی سے مدد مانگی ہے۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ وہ بھی کبھی زمین پر اتریں گے کہ نہیں؟ عبدالولی نے کہا۔

میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ جب ہم زمین خالی کریں گے تب وہ بھی زمین پر اتر آئیں گے۔ والی صاحب ہنسا۔

میں سمجھتا ہوں والی صاحب کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ صاف الفاظ میں کہیں کہ میں کیا کروں۔ عبدالولی اب بھی والی صاحب کے مطلب کو نہ سمجھ سکا۔

میں کہہ رہا ہوں کہ اگر حالات مخدوش ہو گئے تو اس سے پہلے کسی کے بھی حکم کا انتظار مت کرنا روپوش ہو جانا اور بس۔ والی صاحب نے صاف الفاظ میں کہا۔

ٹھیک ہے اگر آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہو گا۔ عبدالولی نے نا سمجھے شخص کی طرح جواب دیا۔

والی صاحب نے عبدالولی کو رخصت کیا۔ عبدالولی اپنے ضلع کی طرف روانہ ہوا۔ عبدالولی راستے میں سوچ رہا تھا کہ یہ کیسا کھیل ہے جو میں سمجھ نہیں پارہا۔ بجائے اس کے کہ شہادت کی طرف جائیں جگہ کیوں خالی کر رہے ہیں۔ وہ بھی ایسے حالات میں جہاں ہم ایک دوسرے سے بے

خبر ہیں۔ میں تو کسی حال میں بھی نہیں جاؤنگا یہیں شہید ہو جاؤنگا مگر یہاں سے جاؤنگا نہیں۔ عبد الولی نے اپنے آپ سے فیصلہ کیا۔

جب اوطاق پہنچا تو ساری باتیں اللہ داد سے کہی۔

مجھے کچھ اندازہ تھا کہ حالات خراب ہو جائیں گے۔ اس سے پہلے کہ حالات یہاں بھی خراب ہو جائیں تم اور سلیم یہاں سے نکل جاؤ۔ اللہ داد نے عبد الولی سے کہا۔
سلیم کو گھر لے جاؤں۔ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ سلیم کے نام پر عبد الولی آپے سے باہر ہو گیا۔

ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اس میں دماغ کے خراب ہونے کی کیا بات ہے۔ اللہ داد نے کہا۔
جب تک اُس پر اُس کے سارے گھر کو زلزلہ دوں تب تک نہیں چھوڑونگا۔ عبد الولی کی آنکھوں میں انتقام نظر آنے لگا۔

واہ بہت اچھے۔ اسلامی امارت کے "امر بی المعروف و نہی عن المنکر" کے امیر بہت اچھے۔ اسی لیے تو اسلامی امارت گرنے کو جا رہی ہے جس میں تم جیسے لوگ حکمران ہیں۔ جو کہ اسلامی احکام اور اصولوں کی بجائے اپنی من مانی کرتے ہیں۔ بدلہ لینے کیلئے اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں۔ اللہ داد جذباتی ہوا۔

کیا کہا؟ عبد الولی کو اُس کی باتوں پر غصہ آ گیا۔

یہ جو ہم اسلام کی بدنامی کا باعث بنے ہیں۔ محمد ﷺ کی میراث پر بیٹھ کر نفرت کا بیج بو رہے ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں اسلام کیلئے نفرت بوئی۔ یہاں اس ضلع میں ڈنڈا ہاتھ میں لیے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ اللہ داد نے ارد گرد اشارہ کیا۔

لوگ خدا سے نہیں تم سے ڈرتے ہیں۔ اسی لیے تو ہر وقت بے وضو نماز کیلئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اس عوام کو دنیا کی اقوام کے ساتھ برابری کیلئے بہت پیچھے چھوڑا۔ اسلام سے محبت کی بجائے ڈر کا طوق ان کے گلوں میں ڈال دیا۔ عبد الولی اخوند! ہم ان بیچارے عوام سے اپنی

مخرومیوں کا بدلہ لے رہے ہیں، حکمرانی کے تقاضے پورے نہیں کر رہے۔ تمہاری مرضی، کلا شکوف اٹھاؤ اور سلیم کی زندگی کا خاتمہ کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُس نے تمہارے اور تمہارے گھر کے ساتھ بہت بُرا کیا ہو گا مگر اتنا بُرا نہیں کیا ہو گا جتنا نبی کریم ﷺ کے چچا زاد بھائی حمزہؓ کے ساتھ ہندہ نے کیا۔ کاش محمد ﷺ کی زندگی اور تعلیمات کے معیار کو ہم اپنی زندگی میں پیدا کرتے۔ اللہ داد اسی جذبات میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

عبدالولی اپنی جگہ پر بت بنا کھڑا رہ گیا۔ آنکھیں اور منہ کھلا دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب تک اللہ داد نکل رہا تھا حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا یہ وہی اللہ داد ہے جو بچپن سے میرے ساتھ ہے۔ ہر چیز میں میرے ساتھ۔ آج اسے کیا ہوا؟

نہیں، نہیں۔ میں تمہاری باتوں میں نہیں آؤنگا۔ میں وہ کرونگا جو میرا دل چاہے گا۔ میری زندگی کے تمام ارمان، اس ظالم نے میری کی ہر خوشی مجھ سے چھین لی ہے۔ زر قاسے بھی شادی کر لی۔ عبدالولی پاگلوں کی طرح اپنے آپ سے غصے اور ارمان کے ملے جلے جذبات میں باتیں کر رہا تھا۔

میں اُسے وہاں ذبح کرونگا جہاں میں ہر روز اپنے ارمان جلاتا آ رہا ہوں۔ اُس کا غلیظ وجود اسی خنجر سے کاٹوں گا۔ عبدالولی نے اپنا خنجر اپنی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

اس خنجر سے اُس کے وجود کا غلیظ خون نکالوں گا۔ عبدالولی پاگلوں کی طرح باتیں کر رہا تھا۔ عبدالولی نے عصر کی گشت کے بعد مغرب کی نماز ادا کی۔ جلدی اوطاق آیا۔ اوطاق میں ایک طالب سے کہا۔

ایک رسی میرے کمرے میں لے آؤ۔

طالب رسی عبدالولی کے کمرے میں لے آیا۔ عبدالولی نے رسی اپنے کپڑوں کے بکس کے ساتھ رکھ دی۔ پھر یہ تسلی کی کہ خنجر اُس کے پاس ہے یا نہیں۔ خنجر بھی پاس تھا۔ عبدالولی نے

اپنے آپ سے فیصلہ کیا تھا کہ آج سلیم کو اُس ندی پر لے جا کر جہاں وہ کبھی کبھار جایا کرتا ہے اُسے ذبح کرے گا۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

رات کو کھانے پر اللہ داد بھی پہلے کی طرح موجود تھا۔ مگر دوپہر کے کھانے پر جو باتیں ہوئیں اُن باتوں نے دھیان خراب کیے ہوئے تھا۔ ایسا نہ ہو کہ عبدالولی نے اُن باتوں کو سنجیدہ لیا ہو اور ناراض ہو۔

حافظ صاحب! آج تمہاری آنکھیں پھر سرخ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں میں نے کچھ زیادہ بول دیا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم مجھ پر اتنا غصہ ہو جاؤ۔ اللہ داد نے ایک مہربان دوست کی طرح کہا۔

اللہ داد اخوند! عبدالولی زندگی سے ناراض ہو سکتا ہے مگر تم سے نہیں۔ میرے پاس زندگی میں اور ہے بھی کیا۔ مجھے زندگی نے کیا دیا ہے سوائے تمہاری دوستی کے۔ تمہاری دوستی میری زندگی کا سرمایہ ہے۔ میں کسی قیمت پر بھی تم سے ناراض نہیں ہو سکتا۔ عبدالولی نے اللہ داد کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر کہا۔

میرا بھی تو تم ہی سب کچھ ہو۔ اس یتیم کی زندگی میں اگر کوئی خوشی ہے تو وہ تمہاری دوستی ہے۔ اللہ داد کو رونا آ گیا۔ اس زندگی نے اگر مجھے محرومیاں ہی محرومیاں دی ہیں تو اُس کے ساتھ ایک تحفہ بھی دیا ہے جو کہ تم اور تمہاری دوستی ہے۔

اللہ داد اخوند! ہم نفرت کی ہوا کے مارے درخت کی مانند ہیں، کبھی بھی ہم پر محبت کا پھول نہیں کھل سکے گا۔ جو یہ توقع کر رہا ہے بُرا کر رہا ہے۔ ہماری رگوں میں اس معاشرے کیلئے خون کی جگہ نفرت دوڑ رہا ہے۔ اس لیے کبھی کبھار دوستی بھی سرخ دیتی ہے۔ عبدالولی نے کہا۔

دونوں دوست واپس دوستی کے آسمان پر چڑھے۔ بہت دیر تک زندگی کی گزرے ہوئے دنوں پر تبصرے کیے۔ پھر سونے کیلئے اُٹھے۔ عبدالولی اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ رسی اور خنجر دونوں نیچے کے ساتھ رکھ دیے۔ اس انتظار میں لیٹ گیا کہ جب رات گہری ہو جائے گی تو پھر اپنے ارادے کو

عملی جامہ پہنائے گا۔ سلیم کیلئے ساتھ والے کمرے میں سونے کیلئے جگہ تیار کی تھی۔ انتظار، انتظار میں آنکھ لگ گئی اور سو گیا۔

خواب میں پھر زر کا وہ دیکھ رہا تھا۔ خواب میں زر کا اسی طرح ہوتی ہے جو بچپن میں تھی۔ زر قامت ساجت کر رہی ہوتی ہے کہ میرے سر سے چادر مت چھیننا۔ میں بغیر چادر کے زندگی نہیں گزار سکتی۔ بغیر چادر کے میری زندگی بے پردہ ہو جائے گی۔ دیکھو مجھے بے پردہ نہ کرنا۔ وہ اُسے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ اُسے دور نہیں کر سکتا۔ زر کا اُس سے چپک جاتی ہے۔ پھر خواب میں زر کا غائب ہو جاتی ہے اور وہ اڑدھا نظر آ جاتا ہے جو اس کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔ پہلے جب اڑدھا اس کی طرف آتا اور اُس کے سینے کی روشنی پر نظر پڑتی تو اڑدھا سر کو جھکا دے کر واپس ہو جاتا۔ مگر آج اڑدھا بتدریج اُس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ اپنے سینے کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہاں روشنی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ روشنی کہاں گئی۔ اڑدھا کو جب دیکھتا ہے تو وہ اُس کے قریب ہو رہا ہوتا ہے۔ وہ بھاگتا ہے مگر بھاگ نہیں سکتا۔ پاؤں ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دیتے۔ اسی وقت اڑدھا اُس کے قریب پہنچ کر اُس پر حملہ کرتا ہے وہ بچاؤ کیلئے ہاتھ مارتا ہے تو اسی اثناء اُس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ بہت ہی زیادہ خوف زدہ اور پسینے میں شراپور بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بستر پر لیٹا رہتا ہے۔ پھر اٹھ کر کلا شکوف، خنجر اور رسی لے کر کمرے سے باہر نکل جاتا ہے۔ رات گہری ہو گئی ہوتی ہے۔ آہستہ سے جا کر محمد گل جگادیتا ہے۔ گاڑی کی چابیاں اُس سے لے کر سلیم کے کمرے میں آ جاتا ہے۔ سلیم کو جگادیتا ہے اور اپنا امامہ اُس کی طرف پھینک کر کہتا ہے۔

یہ باندھ لو اور چلو۔

کہاں، کہاں جانا ہے؟ سلیم اب بھی نیند میں ہوتا ہے۔ جب کچھ ہوش سنبھل گیا تو پھر

پوچھا۔

کہاں جانا ہے اتنی رات کو؟ سلیم نے انکار کے لہجے میں کہا۔

اٹھو جلدی کرو یہ عمامہ باندھ لو۔ زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ عبد الولی نے کلاشکوف کی ٹلی سے سلیم کو دھکا دیا۔

سلیم بھی کیا کرتا، عمامہ اُلٹا سیدھا باندھا، چپل پہنے اور ساتھ روانہ ہوا۔ دونوں گاڑی میں بیٹھے، عبد الولی نے گاڑی سٹارٹ کی اور روانہ ہو گئے۔ وہ گاڑی بہت تیز چلا رہا تھا۔
تھوڑا آہستہ چلو۔ سلیم نے کہا۔

چپ۔ عبد الولی نے انگلی منہ پر رکھتے ہوئے کہا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد عبد الولی ایک چیک پوسٹ پر رُکا۔ دو طالب آئے تو عبد الولی نے اُن سے پوچھا۔
بڑا کہاں ہے؟

حافظ صاحب! وہ تو آج گھر چلا گیا ہے۔

عبد الولی گاڑی سے اترتا ہوا سلیم سے مخاطب ہوا۔
تم بھی اترو۔

وہ بھی نیچے اتر گیا۔

ڈرائیور سے کہو ایک گاڑی نکالے۔ عبد الولی نے ایک طالب سے کہا۔
وہ گیا اُس نے ڈرائیور کو چکایا۔ ڈرائیور نے گاڑی نکالی۔ عبد الولی نے سلیم کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

چچا کے بیٹے! یہ تمہیں بارڈر کراس کرادے گا۔ پھر جہاں تمہاری مرضی جاؤ تم آزاد ہو۔
کیا؟ سلیم کو یقین نہیں آ رہا تھا۔

تم کیا کہہ رہے تھے کہ میں جاؤں؟ سلیم سمجھ نہیں رہا تھا کہ کیا کرے۔ خوشی کے مارے کبھی ادھر تو کبھی اُدھر پھرنے لگا۔

میں جاؤں، میں گھر جاؤں؟ سلیم عبد الولی کے سامنے کھڑا ہوا۔
ہاں گھر جاؤ۔ عبد الولی نے کہا۔

سلیم پاگلوں کی طرح بغیر کچھ کہے بھاگ کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔
اسے بارڈر پار پانچا کر واپس آ جاؤ۔ عبد الولی نے ڈرائیور سے کہا۔ پھر سلیم کی طرف متوجہ
ہو۔ میں تم پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی سر سے چادر اٹھالوں۔ اور ہاں میرے
گھر میں میرے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، سبھے۔
ہاں، ہاں۔ سمجھ گیا۔ کچھ نہیں کہوں گا۔ سلیم کو بہت جلدی تھی۔
جاؤ۔ عبد الولی نے اُسے کاندھے پر پتکی دی۔

وہ روانہ ہوئے۔ عبد الولی کی آنکھوں میں آنسو کے دو بڑے قطرے جم گئے۔ جیسے وہ بھی
اس سے سلیم کی طرح گھر کی خواہش کر رہے ہوں۔ اپنے گھر کے خواہشمند ہوں۔

صبح ناشتے کے وقت اللہ داد جب عبد الولی کے کمرے میں گیا تو عبد الولی ابھی تک سویا
ہوا تھا۔ وہ واپس اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا اور ایک طالب سے پوچھا۔
میں اپنے کمرے میں چائے پیوں گا۔ وہ چائے وہی لے گیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد اللہ داد
اُس کمرے میں گیا جہاں سلیم تھا۔ کمرے کا دروازہ جب کھولا تو سلیم وہاں موجود نہ تھا۔ پریشانی میں
نعرہ لگایا۔

محمد گل اخوند! محمد گل اخوند! کہاں مر گئے۔ محمد گل اخوند! اللہ داد اوطاق کے نیچے کھڑا
آواز لگا رہا تھا۔

ہاں مولوی صاحب! یہاں ہوں، کیا بات ہے؟ محمد گل ایک کمرے سے نکلا۔
یہ آدمی کہاں ہے؟ اللہ داد نے سلیم کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔
اُسے رات کو حافظ صاحب اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر پتہ نہیں کہاں لے گئے۔ محمد گل
نے اللہ داد کو کہا۔

کہاں لے گئے؟ حافظ صاحب اکیلے تھے یا کوئی اور بھی اُن کے ساتھ تھا۔ اللہ داد نے
پریشان ہو کر پوچھا۔

نہیں، کوئی نہیں تھا۔ حافظ صاحب اکیلے تھے۔ محمد گل نے جواب دیا۔
اللہ داد کے ذہن پر تاریکی چھا گئی۔ جلدی جلدی اپنے کمرے میں گیا اُس آدمی کو مار تو
نہیں دیا۔ اللہ داد پریشانی میں خود سے پوچھنے لگا۔
یہ شخص بدلہ لینے کیلئے اندھا ہو گیا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا سوائے بدلے کے۔
اگر اُسے قتل کر دیا ہے تو پھر اتنی گہری نیند کیسے سو سکتا ہے۔ اللہ داد نے اپنے آپ سے
سوال وجواب شروع کر دیے۔

واپس کمرے سے نکلا اور پھر اطاق سے باہر نکلا۔ آدھے گھنٹے کے بعد واپس اطاق آیا۔
چہرے پر بے چینی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ حافظ صاحب اٹھ گئے۔ اللہ داد نے ایک طالب سے
پوچھا۔

ہاں۔ ابھی ابھی میں نے چائے دی۔ طالب نے جواب دیا۔
اللہ داد کا دل ناچاہتے ہوئے بھی اُس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ کمرے کے
دروازے میں کھڑا ہو کر عبد الولی کو دیکھ رہا تھا۔ بڑے غور سے اُس کے چہرے کو دیکھ رہا تھا جیسے
ایکسرے کر رہا ہو۔ عبد الولی ہنسا۔ اللہ داد پھر پُرسکون ہوا۔ چہرے پر خوشی دوڑی۔
آخر آزاد کر دیا۔ کتنا اچھا کام کیا۔ اللہ داد عبد الولی کے سامنے بیٹھ گیا۔
کس کو آزاد کیا، کس کی بات کر رہے ہو۔ عبد الولی نے نا سمجھنے کی انداز میں کہا۔
تمہارا چچا زاد سلیم کا کہہ رہا ہوں۔ اللہ داد نے جو دیا۔
ہاں آزاد کر دیا۔ ہمیشہ کیلئے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا اُسے۔ عبد الولی نے کہا۔
نہیں جناب! یہ ہو نہیں سکتا۔ اللہ داد نے نفی میں سر ہلایا۔
کیوں نہیں ہو سکتا، عبد الولی نے اللہ داد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
آج جو تمہارے چہرے پر اطمینان ہے اور جو تم اتنے پُرسکون ہو یہ میں تمہاری زندگی
میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ اللہ داد نے کہا۔

واقعی یہ بہت ہی اچھا بدلہ ہے۔ اگر دشمن سے بدلہ لینا چاہتے ہو تو اسے معاف کرو۔
اللہ داد اخوند پوری تیاری کی تھی کہ مار دوں گا، مگر یہ اللہ کی مرضی ہے، وہ خوب جانتا ہے۔
عبدالولی نے کہا۔

گھر کے لیے سلام اور خیریت کا احوال کا کہا۔ اللہ داد نے پوچھا۔
نہیں بلکہ یہ کہا کہ میرے بارے میں کسی کو نہ بتانا۔ عبدالولی نے جواب دیا۔
یار، بہت ظالم شخص ہو۔ آخر انہوں کو کس چیز کی سزا دے رہے ہو۔ اللہ داد نے غمزہ لہجے
میں کہا۔

اللہ داد اخوند! سزا نہیں دے رہا ہوں اور انہیں آزمائش میں انہیں ڈالنا چاہتا۔ میرا جانے
کا کوئی ارادہ نہیں۔ حالات دن بدن خراب ہوتے جا رہے ہیں، میں نہیں چاہتا کہ میدان چھوڑ دوں
اور بھاگ جاؤں۔ شہادت قبول ہے مگر میدان سے نہیں بھاگوں گا۔ تو اگر زندہ ہونے کے بارے
میں انہیں اطلاع ملے تو وہ پھر پُر امید ہو جائینگے۔ اُمید نہیں دلانا چاہتا۔ اب وہ صبر کر چکے ہونگے۔ مر
گیا ہے یہی سمجھ رہے ہونگے۔ دوسری بار کے موت کا زخم نہیں دینا چاہتا۔ پُرانے زخم بہت ہیں جو
میں نے انہیں دیے ہیں۔ عبدالولی کے لہجے میں تبدیلی صاف دکھائی دے رہی تھی۔

یار پاگل مت بنو، تم دیکھ نہیں رہے کتنے لوگ آرہے ہیں۔ امریکہ کے مقابلے کی قوت
ہمارے ان بازوؤں میں نہیں، لوگ نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں میں تو کہتا ہوں ابھی نکل جاؤ، آدھے
سے زیادہ علاقہ طالبان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ یہاں پر بھی نشان زدہ جگہوں پر بمباری ہو رہی ہے۔
بہت جلد یہ علاقہ بھی طالبان کے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔ اللہ داد نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

اللہ داد اخوند! میں نے پوری زندگی اس کیلئے وقف کی ہے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔
میں تو موت کی خواہش رکھتا ہوں۔ زندگی میں اندھیروں کے سوا کچھ نہیں۔ کم از کم شہادت تو نصیب
ہوگی۔ میری طرف آتے ہیں یا نہیں، میں میدان نہیں چھوڑوں گا۔ آزمائش کے وقت میدان سے
فرار ہونا میں بے غیرتی سمجھتا ہوں۔ عبدالولی نے کہا۔

کسے غیرت دکھاؤ گے۔ امریکن تمہارے لیے نیچے اتریں گے، قطعاً نہیں۔ تمہارے مسلمان بھائی کے ہاتھوں میں بندوق دے گا اور ہمارے لیے بھی بندوق کا بندوبست کرے گا، وہ ہمیں ماریں گے ہم انہیں۔ پچھلا کھیل دوبارہ شروع ہو جائے گا۔ ایک کافر اور دوسرا مسلمان بن جائے گا۔ اللہ داد نے ایک تجربہ کار کی طرح کہا۔

جو کافروں کے ساتھ کھڑے ہوں ان کے خلاف جنگ کرنا جہاد ہے۔ عبدالولی جذباتی

ہو۔

یہ تو میری اور تمہاری سوچ ہے۔ عوام ہمیں عزت دے رہی ہے، ہر حکم مانتی ہے، اس طرح نہیں ہے۔ یہ سب کچھ خوف سے کرتے ہیں۔ ہم نے ان کے سر ڈنڈے سے سیدھے کیے ہیں۔ ہمیں اللہ نے بہت اچھا موقع دیا مگر ہم نے ضائع کیا۔ عوام میں ہم نے دین پاک اسلام کی محبت کی بجائے نفرت بکھیری، اور دنیا میں بھی اسلام نہ بدلنے والے نہ ماننے والے دین کے نام پر متعارف کروایا۔ اللہ داد نے حقیقت کی طرف نشاندہی کی۔

اللہ داد اخوند! اس طرح کے لوگ بہت کم ہیں جو تمہاری طرح کی سوچ رکھتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ خواہوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ زندگی کا نام حقیقت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ٹیڑھے منہ ٹوپی مکے سے سیدھے ہوتے ہیں۔ عبدالولی نے ہاتھ سے مکا بنا کر کہا۔

اس ملک کے عوام کی بد بختی یہی ہے کہ ہر کوئی ان کے سروں پر حکمرانی کرنے کا خواہش مند ہے۔ دل کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ اسی لیے یہ بھی ایسے بن گئے ہیں کہ جس کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھا اسی کے سامنے سر ہلاتے ہیں۔ اللہ داد نے بہت ہی مایوس کن لہجے میں کہا۔

تم کیوں فکر کرتے ہو، فکر وہ کرے جس کے پاس فکر نہ ہو۔ چلو باہر گشت پر نکلتے ہیں۔ عبدالولی نے کہا۔ پھر دونوں باہر نکل گئے۔

(۲۲)

رات کو عبد الولی نے ریڈیو میں سنا تھا کہ طالبان کا دور حکومت بہت جلد ختم ہونے والا ہے۔ جنوب کے کچھ صوبے اب بھی ان کے کنٹرول میں ہیں جو جلد ان کے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔

صبح جب یہ لوگ گشت کر رہے تھے تو لوگوں کے چہروں سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ جلد تم لوگوں کے زور زبردستی اور پابندیوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ عبد الولی نے اللہ داد سے پوچھا۔

ان لوگوں کے رویوں میں تبدیلی نہیں آئی؟

ہاں صاف دکھائی دے رہا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ منہ سے نہیں بول رہے مگر ان کے اٹھنے بیٹھنے سے یہ تبدیلی دیکھی جاسکتی ہے۔ اللہ داد نے اُس کی باتوں کی تصدیق کی۔
ان میں اب مدافعت کی طاقت باقی نہیں رہی ورنہ یہ قوم ہر غاصب کے خلاف لڑی ہے۔ عبد الولی نے اللہ داد سے کہا۔

ایسا نہیں ہے جیسے تم کہہ رہے ہو۔ مدافعت کی طاقت ہے لیکن بھروسہ نہیں کر رہے۔
اب یہ کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ جس کسی کے ساتھ دوستی کی ہے انہوں نے انہیں دھوکا دیا ہے۔
اللہ داد نے جواب دیا۔

اللہ داد اخوند! میں کافی عرصے سے محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارا طالبان کے ساتھ اختلاف ہے اور پھر تمہارے زخمی ہونے کے بعد یہ اختلاف شدت اختیار کر گیا ہے۔ عبد الولی نے دل میں پیدا ہونے والے شک کا اظہار کیا۔

حافظ صاحب! ہم بہت سادہ ہیں۔ لوگ ہمیں اپنے منافع کیلئے بہت آسانی سے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کس طرح تو کبھی کس طرح۔ کاش اس عوام کا ایک عالم، دانا اور حقیقی رہنما ہوتا۔

میں یقین سے کہتا ہوں کہ ہر چیز ان کے ہاتھوں میں ہوتی۔ اللہ داد نے بھی بلا خوف اپنی بات کہہ ڈالی۔

کیا مطلب! ہمارے رہنما نہیں سمجھتے، حقیقی رہنمائی نہیں کر رہے، یا پھر کچھ اور؟
عبدالولی نے حیرانی سے پوچھا۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ نہیں کرتے۔ کرتے ہونگے۔ جو علم رہنمائی کیلئے چاہیے ہو سکتا ہے اس میں ہم ابھی تک پیچھے ہوں۔ اپنی سوچ سے فیصلہ کرنے کا حوصلہ ضروری ہے۔ ہم تو ایسے کار توں ہیں کہ جس نے چاہا جس بندوق میں ڈالا اسی سے نکلتے ہیں۔ اللہ داد نے جواب دیا۔

میں آخر تک تمھاری یہ بات نہیں سمجھ سکا۔ عبدالولی نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔
یہی تو کہہ رہا ہوں، مطلب بھی یہی ہے کہ تمھارے جیسے لوگ نہیں سمجھتے۔ اگر سمجھ گئے تو وہ دن تبدیلی کا ہو گا۔ اس عوام کے مسائل کے اختتام کا دن۔ لیکن یہ مجھے مشکل لگتا ہے۔
اللہ داد نے ناامیدی میں سیٹ سے سر لگاتے ہوئے کہا۔

دوپہر کو جب گشت سے واپس آئے تو اللہ داد نے عبدالولی سے کہا۔

میں چاہتا ہوں اپنے گاؤں جاؤں۔ اپنے قبرستان جاؤں۔

گاؤں کا کیا کرو گے؟ پچھلے سال جب گئے تھے تو تم نے کہا تھا کہ وہاں چند گھروں کے سوا کچھ نہیں اور قبرستان میں بھی ماں باپ کی قبریں معلوم نہیں۔ عبدالولی نے کہا۔

تمھاری بات ٹھیک ہے۔ مگر ماں کو میں نے رات کو خواب میں دیکھا، آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہاتھ میرے لیے ایسے پھیلائے تھے جیسے وہ بہت ہی اداس ہو۔ قبرستان جا کر دعا کروں گا اور دو رکعت نفل بھی پڑھ لوں گا۔ کچھ دل کو تسلی ہو جائے گی۔ اللہ داد نے کہا۔

ٹھیک ہے، ایسا کرو کہ گاڑی ساتھ لے جاؤ۔ محمد گل اخوند اور چند طالبان بھی ساتھ چلے جائیں گے۔ سیر بھی کر لو گے، واپسی پر اگر دیر بھی ہو جائے گی تو ساتھ رہیں گے۔ میں چھوٹے طالب کے ساتھ اگر کوئی کام ہو تو نکل جاؤں گا۔ عبدالولی نے مشورہ دیا۔

اللہ داد نے بھی عبد الولی کے مشورے پر عمل کیا اور چند طالبان کے ساتھ اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبد الولی نے ریڈیو کو آن کیا۔ ریڈیو میں یہ خبریں جاری تھیں کہ بہت جلد اُن کے صوبے پر زمینی حملہ ہو گا۔ ارد گرد کے صوبے تقریباً قبضہ کر لیے گئے ہیں۔

عبد الولی نے اوطاق میں رہ جانے والا چھوٹا طالب، دو اور طالبان کو بلا کر ان سے کہا۔ تم لوگ والی صاحب کے دفتر جاؤ اور حالات معلوم کرو۔ صبح سے وائرلس کام نہیں کر رہا۔ ریڈیو کی خبروں نے عبد الولی کو تشویش میں ڈالا۔ طالبان نے گاڑی سٹارٹ کی اور والی کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔ عبد الولی اوطاق میں اکیلا رہ گیا۔ اپنا اسلحہ سمیٹا اور اپنی پسند کی ایک کلاشنکوف بکسے سے اٹھائی۔ گولیوں کا کمر بند اٹھایا اور پانچ میگنیزین گولیاں بھریں۔ کمر بند بھی گولیوں سے بھرا، کمرے میں تیار کر کے رکھا اور پھر خود کمرے کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔

اللہ داد اور اُس کے ساتھیوں کو قریباً چار گھنٹے ہوئے کہ نکل چکے تھے۔ باقی طالبان کو تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ عبد الولی واپس اٹھ کر اوطاق کے کمرے میں پھرنے لگا۔ اسی اثناء والی کے دفتر گئے ہوئے طالبان واپس آ گئے۔ عبد الولی بھاگ کر اُن کے پاس گیا اور پوچھا۔

ہاں کیا ہوا، والی صاحب ملے؟

حافظ صاحب! والی صاحب کے دفتر میں ہم نے پوچھا انہوں نے کہا کہ والی صاحب پچھلے دو دنوں سے گئے ہیں۔ ایک طالب نے جواب دیا۔

پوچھا کہ کہاں گئے ہیں؟ عبد الولی نے پوچھا۔

ہاں ہم نے پوچھا تھا مگر انہوں نے کہا کہ ہمیں معلوم نہیں کہ کہاں گئے ہیں۔ طالب نے کہا۔

تم لوگ ایسا کرو کہ اپنے اپنے اسلحے تیار کرو۔ گولیاں بھی دیکھ لو اور جمع کرو۔ اب ہم یہاں سے کوچ کریں گے۔ عبد الولی نے کہا۔

کہاں جائیں گے؟ طالب نے پوچھا۔

اس شہر میں پھریں گے اور کہاں۔ جب تک ہم بااختیار ہیں لوگوں کے گھروں میں رہیں گے۔ اگر کہیں مشکل آ پہنچی تو پھر چھاپہ مار جنگ کیلئے نکلیں گے۔ عبدالولی نے اپنے آپ سے کیا ہوا فیصلہ سنا دیا۔

حافظ صاحب! آپ ایسا کیوں کہہ رہے ہو، کوئی خاص بات ہے کیا؟ ایک طالب نے

پوچھا۔

تم لوگوں نے راستے میں ضرور محسوس کیا ہو گا۔ مجھے ریڈیو سے معلوم پڑا ہے کہ یہاں حملہ ہونے والا ہے تو اس سے پہلے کہ وہ ہماری اوطاق تک پہنچیں ہمیں چاہیے کہ ہم اوطاق خالی کریں۔ عبدالولی نے جواب دیا۔

یہاں وہ تیاری میں مصروف تھے خبر آئی کہ اللہ داد اور اُس کے ساتھیوں کی گاڑی پر حملہ ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے ساتھ اسلحہ اٹھایا اور اللہ داد اور اُس کے ساتھیوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں جب پہنچے تو دیکھا کہ اللہ داد کی گاڑی بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ موقع پر موجود لوگوں نے کہا کہ زخمیوں اور لاشوں کو صوبے کے بڑے ہسپتال لے جایا جا چکا ہے۔ انہوں نے گاڑی بڑی تیزی سے ہسپتال کی طرف روانہ کی جب ہسپتال پہنچے تو محمد گل اور اللہ داد کے سوا جو بہت شدید زخمی تھے تمام ساتھی جاں بحق ہو چکے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک ہیلی کاپٹر نے گاڑی کو راکٹ سے نشانہ بنایا۔

ہسپتال میں لوگوں کا رش زیادہ ہو گیا۔ اور زخمی بھی لائے گئے۔ ان زخمیوں میں عورتیں اور بچے تھے مگر طالبان کی تعداد زیادہ تھی۔ ہسپتال میں دوائیوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹروں کی بھی قلت تھی۔ وہ طالبان موجود تھے جو پٹی وغیرہ کر سکتے تھے۔ وہ ڈاکٹروں کی ڈیوٹی سرانجام دے رہے تھے۔

عبدالولی اللہ داد کے سرہانے کھڑا تھا۔ اللہ داد شدید زخمی تھا۔ اگرچہ اس کے زخموں پر پٹی بندھی تھی لیکن وہ اب تک بے ہوش تھا۔ عبدالولی بہت بے چین تھا۔ اللہ داد کے ساتھ اور

بھی اُس کے جاننے والے طالبان زخمی تھے۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ ساتھ ہی محمد گل زندگی اور موت کی کشمکش میں تھا۔ وہ جیسے ہی اُس کے قریب ہوا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھا اُس نے آنکھیں کھول لی۔ اور ایک ہچکلی اور ہمیشہ کیلئے آنکھیں بند کیں۔ اُس نے اُس کے چہرے پر چادر ڈالی اور اللہ داد کی طرف آیا۔ جب اُسے ٹیکا لگایا جا رہا تھا تو اُس نے جلدی سے اللہ داد کا ہاتھ ٹیکے کیلئے پکڑا۔

کونسی جگہ زیادہ زخمی ہوئی ہے؟ عبد الولی نے طالب ڈاکٹر سے پوچھا۔
 کیا کہوں کہ کونسی جگہ زخمی ہے، دوسروں نے زخم صاف کیے ہیں میں نے نہیں دیکھے۔ میں تو صرف درد کا ٹیکا لگا رہا ہوں۔ ڈاکٹر طالب نے جواب دیا۔

کیا ہو گا اس کا؟ عبد الولی نے پر امید نظر سے دیکھا۔
 خدا کی مرضی۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہو گا۔ ڈاکٹر طالب نے جواب دیا۔
 عبد الولی کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو نظر آنے لگے۔ رات گئے ایک بار اللہ داد نے آنکھیں کھول لیں پھر دوبارہ بے ہوش ہوا۔ کچھ دیر کے بعد پھر ہوش میں آیا۔ عبد الولی ساتھ بیٹھا اُٹھ کر اُس کے قریب ہوا۔

اللہ داد اخوند! کیسے ہو؟

اللہ داد کے ہونٹوں پر ایک تبسم سی ابھری، سر کو ہلایا، پھر پانی مانگنے کا اشارہ کیا۔ عبد الولی نے جلدی سے پانی کا گلاس دیا۔ اللہ داد نے پورا گلاس پانی پی لیا۔ عبد الولی نے چاہا کہ ایک گلاس پانی اور لے آئے لیکن اللہ داد نے منع کیا۔ اللہ داد کا سر عبد الولی کے سینے کے ساتھ لگا ہوا تھا کہ اچانک ایک نافرمان آنسو کا قطرہ اللہ داد کے چہرے پر آگرا۔ اللہ داد نے عبد الولی کی طرف دیکھا۔ داہنا ہاتھ بڑی مشکل سے اُٹھا کر عبد الولی کے ہاتھ پر رکھا۔ بہت دھیمی آواز میں اُس سے کہا۔

مجھ سے ایک وعدہ کرو۔

تم بولو کہ کیا کروں۔ تم جو بولو گے میں وہی کروں گا۔ عبد الوالی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر تھوڑا سا اٹھایا۔

تم اس ملک سے نکلو گے اور اپنے گھر جاؤ گے۔ اللہ داد نے نجیف آواز میں کہا۔
تمہیں اس حال میں چھوڑ کر چلا جاؤں، کیوں مجھے بے غیرت سمجھا ہے۔ عبد الوالی جذباتی ہوا۔

جب تک میں زندہ ہوں مت جانا، لیکن اگر میں۔۔۔۔۔
عبد الوالی نے اللہ داد کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔
بس اور آگے کچھ مت کہنا۔ تم میرا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ جب تم ٹھیک ہو جاؤ تو دونوں ساتھ چلیں گے۔ عبد الوالی نے رونے کی انداز میں کہا۔
مجھے یقین نہیں، میں سمجھ رہا ہوں اب صرف دعا کرنا ہوگی۔ اگر چاہتے ہو کہ میرے ساتھ وفا کرو تو میرا اسلام اپنی ماں کو ضرور پہنچانا۔ وعدہ کرو کہ یہ کام کرو گے۔ اللہ داد نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا۔

وعدہ ہے میرا، ضرور کروں گا سلام، انشاء اللہ۔ لیکن اللہ تمہیں صحت دے۔ عبد الوالی نے کہا۔

اللہ داد نے اپنا سر اُس ک گود میں ڈھیلا کیا اور آنکھیں بند کیں۔ جیسے وہ مطمئن ہو چکا ہو۔ عبد الوالی نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔
جلدی کرو اس گلاس میں پانی لے آؤ۔ وہ گلاس پانی سے بھر کر لے آئے۔ عبد الوالی نے اُس کا سر گود سے اٹھایا اور اُسے پانی پلایا۔

اللہ داد نے آدھا گلاس پانی پی لیا اور پھر گلاس سے منہ ہٹالیا۔ ایک گھنٹے کے بعد اللہ داد کی حالت خراب ہو گئی۔ عبد الوالی نے اُس کا سر اپنی گود میں رکھا تھا۔ اللہ داد ایک بار آنکھیں کھول

لیتا پھر اُس پر بے ہوشی طاری ہو جاتی۔ آخری بار آنکھیں کھولیں، عبد الوالی کی طرف دیکھا اور پھر اسی طرح آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ جیسے عبد الوالی کی تصویر وہ اپنی آنکھوں میں محفوظ کرنا چاہتا ہو۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ عبد الوالی نے دُعا پڑھی اور اُس کی آنکھیں اپنے ہاتھوں سے بند کر دیں۔

اپنے تمام ساتھیوں کو جو شہید ہوئے تھے کو گاڑی میں ڈالا اور اپنے اوطاق کی طرف روانہ ہوا۔ صبح کو ارد گرد کے لوگوں کو بلایا۔ اللہ داد کے ساتھ تمام ساتھیوں کو اپنے اوطاق میں سپرد خاک کیا۔ اُس کے بعد ساتھیوں کو اجازت دی اور خود اللہ داد سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کیلئے بارڈر کی طرف چل پڑا۔

(۲۳)

عبدالولی جب گھر کے دروازے کے قریب پہنچا تو رات نے اپنی چادر اوڑھ چکی تھی۔ گیارویں رات کی چاند نے بھی اپنی روشنی عبدالولی جیسے مسافر کو راستہ دکھانے کیلئے کھیر، رکی تھی۔

دل کبھی چاہتا تو کبھی نہ چاہتا۔ دروازے کے پاس کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ گھر میں کون ہوگا؟ مجھے پہچان بھی پائیں گے یا نہیں؟ دیر بھی ہو چکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی چور کا گمان کرے۔ پھر ہمت کی، دروازے کو آہستہ دھکا دیا۔ دروازے کے کھلنے سے ایک آواز کانوں تک پہنچی۔

میرا لاڈلہ آئے گا، کالی آنکھیں، سفید دانت، سیاہ بالوں پر سفید عمامہ ہوگا۔ سینے میں قرآن کا نور ہوگا۔ علم کے خزانے سے سب کی جھولی بھر دے گا۔ اے اللہ! آپ کی راہ میں گیا ہے۔ میں نے تو آپ کے توکل پر بھیجا تھا۔ پھر کیوں آپ نے اُسے جیتے جی مجھ سے چھینا۔ آواز سسکیوں میں گم ہو گئی۔ کچھ دیر بعد پھر آواز آئی۔

میرا لاڈلہ ضرور آئے گا۔

عبدالولی نیم وادرووازے میں کھڑا تھا اچانک اُس کا ہاتھ دروازے کی زنجیر سے لگا۔ تم آگئے، خدا نے میری سُن لی۔ دروازے سے دور چارپائی پر لیٹے کسی نے کہا۔ آؤ، آؤ۔ میں نے یہ چارپائی تمہارے لیے یہاں رکھی ہے کہ میرا اولی خان بیٹا آئے گا۔ قریب آؤ، ماں تمہارے صدقے۔ آج شام سے تمہاری خوشبو میں محسوس کر رہی تھی۔ عبدالولی سمجھ نہیں سکا کہ وہ کس طرح ماں کی چارپائی تک پہنچا۔ اور نہ یہ سمجھ سکا کس وقت اُس نے ماں کے سینے پر سر رکھا۔ سر اٹھایا تو ماں کا سینہ اُس کے آنسوؤں سے ایسا تر ہوا تھا جیسے بارش ہو گئی ہو۔ اور بال ایسے بھیگ چکے تھے جیسے دھوئے گئے ہوں۔

ولی بیٹو! تمہیں پتہ ہے تمہارے جانے کے بعد میں نے یہ دروازہ بند نہیں کیا اور نہ ہی سردیوں میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا ہے۔ میں تو تمہاری طرح ظالم نہیں جو بھول گئے۔ میرے دل کے آنگن میں چراغ کی طرح جل رہے تھے۔ یہ چراغ میں نے دل کے خون سے جلانے رکھے ہیں۔ تمہارے سینے میں تو قرآن کی روشنی بھی ہے پھر تم نے کیوں منہ پھیرے رکھا۔

بس ماں بس! عبد الولی نے ماں کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔ میرے سینے میں اندھیرا ہے صرف اندھیرا۔ میں تو اُن جیسا رہ گیا ہوں جو نہ دین کے رہے نہ دنیا کے۔ ماں میں اُٹ گیا، قرآن میرے سینے سے نکل گیا ہے۔ محبت میرے دل سے نکل گئی ہے۔ عقل میرے دماغ سے نکل گئی ہے۔ اور دید میری آنکھوں سے چلی گئی ہے۔ ماں آپ کا بیٹا اُس جواری کی طرح ہے جو اپنی ماں کا پیدار بھی ہاں چکا ہو۔ آپ نے میرے انتظار میں چار پائی صحن کے درمیان رکھی ہے اور میں نے آپ کا پیدار تک دل سے نکال دیا ہے۔ میں اس قابل نہیں کہ کوئی میرا انتظار کرے۔ بیٹا کہہ کر پکارے۔ اپنے آنسو میرے لیے بہائے۔ مجھے یہ حق حاصل نہیں۔ میں یہ حق کھو چکا ہوں ماں۔ عبد الولی نے کہا۔

ایسا مت کہو۔۔۔۔۔ ماں تمہارے صدقے۔۔۔۔۔ ایسا مت کہو۔۔۔۔۔ ایک بار اپنا ماتھا میرے قریب کرو، ہونٹ تمہارا ماتھا چومنے کیلئے سوکھ چکے ہیں۔ ماں نے عبد الولی کے ماتھے پر اپنے ہونٹ رکھ لیے۔

ماں کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ اُس کے ماتے سے اپنے ہونٹ جو کہ عبد الولی کے انتظار میں سوکھ گئے تھے ہٹا لے۔ مگر نہ وقت رُک سکتا تھا نہ یہ دونوں اسی طرح رہ سکتے تھے۔ کیونکہ وقت کبھی کبھی ارمان بھی قتل کر دیتے ہیں۔ ماں نے جب ہونٹ ماتھے سے ہٹائے تو عبد الولی نے کہا۔

ماں! جب سے آپ کی باہوں سے نکلا ہوں پھر سکون نصیب نہیں ہوا۔ ماں جب آپ لوگوں نے مجھے طالب بنایا ابھی تک طلب میں ہوں۔ طلب ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔ مجھے دنیا کے ہر شخص نے طالب کی نظر سے دیکھا۔ اُس طالب کی طرح جو نہ دل رکھتا ہے اور نہ دل میں جذبات۔ مولوی نے مسجد میں وظیفہ اکٹھے کرنے کیلئے چادر دی۔ ہر گھر کے سامنے وظیفہ کی طلب

نے کھڑا کر دیا۔ مدرسہ میں چندہ کاپی دے دی گئی۔ ہر مسجد میں فقیر کی طرح چادر بچھائی۔ تمہارے اس طالب بیٹے کو کسی نے کیا دیا ہے۔ کچھ نہیں۔۔۔۔ ابھی تک طلب میں ہوں۔ محبت کی طلب، سکون کی طلب، میں کبھی مولوی نہیں بن پاؤنگا ماں۔ آپ کے طالب کو دنیا نے کشکول ہاتھ میں دے دیا ہے۔ پھر ایسا نہیں کہ صرف درہ در بلکہ بے در بھی ہو گیا ہوں، اور بے درد بھی۔ ہر طالب میری طرح بے در اور بے درد ہے۔ نہ اُس کا گھر ہے نہ بھائی۔ نہ کسی کا اپنا ہے اور نہ ہی کوئی اُس کا اپنا۔

ماں! ماؤں سے کہو کہ طالب پیدا نہ کریں۔ طالب کو یہ معاشرہ بڑی بیخ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اس معاشرے کے منفی رویوں کا پیدا کردہ کردار ہے۔ جو ہر وقت منفی رویے کی نمائندگی کرتا ہو گا۔ ہمارے ہاں ہر گھر میں ایک طالب ہے ماں۔ جب تک یہ معاشرہ طالب پیدا کرے گا اور فقیر کی نظر سے دیکھے گا، سینوں میں قرآن کی روشنی سے بدلہ لینے کی آگ جلتی رہے گی۔ عبد الوالی نے چند جملوں میں اپنی زندگی کا حال بیان کر دیا۔

دونوں صبح تک اسی چارپائی پر بیٹھے رہے اور ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے رہے۔ صبح والد اور بھائی وغیرہ کو پتہ چلا تو گھر میں خوشی کا ایک طوفان اُٹ آیا۔ وہ طوفان جسکا برسوں سے اس گھر نے انتظار کیا تھا۔ پہلوان نے صبح مسجد میں مولوی صاحب کو کہا کہ رات کو عبد الوالی گھر آیا۔ نماز کے بعد مولوی صاحب نے مسجد میں اعلان کیا کہ پہلوان کا بیٹا حافظ عبد الوالی صاحب گھر پہنچے ہیں ہمیں چاہیے کہ اُسے سلام کرنے جائیں۔ گاؤں کے تمام لوگ مرد اور عورتیں عبد الوالی کے گھر مبارک باد دینے آئے۔ اُس پاس کے گاؤں کے لوگ جنہیں یہ خبر ملتی وہ بھی مبارک باد دینے آئے۔ دو ہفتے ایسے مبارک بادوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ ایک دن ایک بڑی کالی رنگ کی گاڑی جس کے شیشے بھی کالے تھے عبد الوالی کے گھر کے سامنے رُکی۔ دو انجان آدمی گاڑی سے اترے اور عبد الوالی کے گھر کی پیشک میں عبد الوالی سے سلام ودعا کیا۔

عبدالولی نے اُن سے پوچھا کہ میں نے آپ لوگوں کو پہچانا نہیں، میرے خیال میں تمہارے جاننے والے ہیں۔ عبدالولی نے اپنے بھائی احمد خان سے کہا۔
حافظ لالا! میں بھی نہیں جانتا۔ احمد خان نے جواب دیا۔
ہم جان پہچان والے لوگ ہیں حافظ صاحب۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا۔
چائے پینے ک بعد انہوں نے رخصت چاہی۔ دروازے میں جس وقت عبدالولی انہیں رخصت کر رہا تھا تو ایک شخص نے کہا۔
حافظ صاحب! آپ کو والی صاحب نے یاد فرمایا ہے۔
کون والی صاحب؟ عبدالولی نے حیران ہو کر پوچھا۔
آپ جس صوبے میں اپنی ذمہ داری سرانجام دے رہے تھے وہ والی صاحب۔ شخص نے جواب دیا۔

کہاں ہے والی صاحب؟ عبدالولی نے پوچھا۔
وہ کوسٹہ کینٹ میں ہیں اور آپ کو سلام کہہ رہے تھے۔ اور یہ پیغام دیا ہے کہ آپ اُن سے ضرور ملیں۔
عبدالولی اسی طرح دروازے میں حیران کھڑا رہ گیا اور لوگ چلے گئے۔

ختم شد

**Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library**